



دادا ابو کا صندوق

NAZMHUB

پرائی حویلی کا خزانہ

adventure

مکمل کتاب - تمام 12 اقساط

اقساط کی فہرست

Sheher ki sab se purani haveli mein chhupa khazana — aur

us tak pohanchne ke liye paheliyon ka silsila. Dosti aur

.himmat ki kahani

1. قسط 1 — دادا ابو کا صندوق
2. قسط 2 — تہہ خانے کا دروازہ
3. قسط 3 — نواب کا راز
4. قسط 4 — چوتھا دروازہ
5. قسط 5 — خالی صندوق
6. قسط 6 — دو چابیاں اور ڈوبتا سورج
7. قسط 7 — صبح کی اذان سے پہلے
8. قسط 8 — چوتھا دروازہ
9. قسط 9 — باؤلی کا محافظ
10. قسط 10 — چوری شدہ وقف نامہ
11. قسط 11 — چوتھی مہر
12. قسط 12 — امانت

بارش کی وہ شام حمزہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

بادل سہ پہر سے ہی آسمان پر چھائے ہوئے تھے، اور اب شام کے سائے گہرے ہوتے ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ گلی میں بہتا پانی نالیوں سے ابل رہا تھا، اور بجلی ہر چند منٹ بعد چمک کر پورے محلے کو ایک لمحے کے لیے دن کی طرح روشن کر دیتی۔ حمزہ اپنے دادا ابو کے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا بارش دیکھ رہا تھا۔ دادا ابو — بیاسی سال کے کمزور مگر روشن چہرے والے بزرگ — چارپائی پر لیٹے کھانستے ہوئے اپنی تسبیح پھیر رہے تھے۔

“دادا ابو، آپ نے دوا لی؟” حمزہ نے پوچھا۔

“لے لی بیٹا، لے لی،” دادا ابو نے مسکرا کر کہا۔ ان کی آوازیں وہی پرانی گرمی تھی جو حمزہ کو بچپن سے سکون دیتی آتی تھی۔ “تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ بارش میں بھگینے کا ارادہ ہے کیا؟”

حمزہ ہنس پڑا۔ “نہیں دادا ابو، بس دیکھ رہا ہوں۔ امی کہہ رہی تھیں کہ آپ کے کمرے کی الماری صاف کرنی ہے، پرانا سامان نکالنا ہے۔”

دادا ابو کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ابھرا۔ جیسے کوئی پرانی یاد اچانک جاگ اٹھی ہو۔ ”الماری؟“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں... وہاں ایک پرانا صندوق بھی ہے۔ لکڑی کا۔ اسے مت چھونا، حمزہ۔“

”کیوں؟“ حمزہ کی تجسس جاگ اٹھا۔ سولہ سال کی عمر میں ”مت چھونا“ سننا کسی خزانے کا نقشہ ملنے جیسا تھا۔

”بس... پرانی یادیں ہیں اس میں۔ کچھ چیزیں بھولی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں۔“ دادا ابو نے آنکھیں بند کر لیں، جیسے بات ختم ہو گئی ہو۔

مگر حمزہ کا دل اب بے چین ہو چکا تھا۔ اس کی نظریں کمرے کے کونے میں رکھی پرانی الماری کی طرف اٹھیں۔ الماری کے نیچے، دھول میں اٹا ہوا، واقعی ایک لکڑی کا صندوق نظر آ رہا تھا۔ اس پر پیتل کی پٹیاں لگی تھیں جو زنگ سے کالی پڑ چکی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد جب دادا ابو سو گئے اور ان کے خراٹوں کی آواز کمرے میں گونجنے لگی، حمزہ دبے پاؤں الماری کی طرف بڑھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے صندوق کو کھینچا۔ وہ حیرت انگیز طور پر ہلکا تھا۔ ڈھکن پر ایک چھوٹا سا تالا لگا تھا، مگر زنگ کی وجہ سے وہ بس چھونے سے ہی ٹوٹ کر گر پڑا۔

حمزہ نے ڈھکن اٹھایا۔

اندر پرانے کاغذوں کی بو اٹھی۔ وہ مخصوص خوشبو جو صرف بہت پرانی کتابوں اور خطوں سے آتی ہے۔ سب سے اوپر ایک زرد پڑتا ہوا لفافہ تھا، اس کے نیچے کچھ تصویریں، اور سب سے نیچے... ایک چھوٹی سی لکڑی کی ڈبیا۔ حمزہ نے ڈبیا کھولی تو اس کی سانس رک گئی۔ اندر ایک پیتل کی چابی تھی، عجیب و غریب نقش و نگار والی، اور اس کے ساتھ کاغذ کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا۔ جیسے کسی بڑے نقشے کا ایک حصہ۔

کاغذ پر مدہم سیاہی سے کچھ لکھا تھا۔ حمزہ نے اسے کھڑکی کی روشنی میں کیا۔ وہ ایک شعر تھا:

نہ میں بولتا ہوں، نہ میں چلتا ہوں پھر بھی ہر راہی کو منزل دکھاتا ہوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی پورا ہوں جو مجھے جوڑے، وہی راز پاتا ہے

حمزہ کے ہاتھ کانپنے لگے۔ یہ کوئی عام کاغذ نہیں تھا۔ یہ... یہ کسی معے کا حصہ لگتا تھا۔ اس نے لفافہ اٹھایا۔ اس پر دادا ابو کے ہاتھ سے لکھا تھا: ”نواب صاحب کی امانت۔“

”حمزہ!“

اچانک دادا ابو کی آواز گونجی۔ حمزہ نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ دادا ابو چارپائی پر اٹھ بیٹھے تھے، اور ان کی آنکھوں میں ایک ایسا خوف تھا جو حمزہ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”وہ... وہ کاغذ کہاں سے لیا تم نے؟“ دادا ابو کی آواز کانپ رہی تھی۔

”صندوق سے... دادا ابو، یہ کیا ہے؟ یہ نواب صاحب کون ہیں؟ یہ نقشہ۔“

”رکھ دو اسے! ابھی! اسی وقت!“ دادا ابو اتنی زور سے چلائے کہ حمزہ سہم گیا۔ پھر ان کی آواز نرم پڑ گئی، اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”بیٹا... کچھ دروازے کبھی نہیں کھولنے چاہئیں۔ یہ امانت ہے... اور امانت کا بوجھ بہت بھاری ہوتا ہے۔“

”مگر دادا ابو۔“

”وعدہ کرو مجھ سے،“ دادا ابو نے حمزہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ان کا ہاتھ ٹھنڈا اور کانپتا ہوا تھا۔ ”وعدہ کرو کہ تم اس حویلی کے قریب بھی نہیں جاؤ گے۔“

”کون سی حویلی؟“

دادا ابو نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں بارش میں ڈوبا ہوا محلہ نظر آ رہا تھا۔ دور، پرانی آبادی کے پار، ایک عظیم الشان مگر ویران عمارت کا سلیوٹ دکھائی دے

رہا تھا۔ اونچی میناریں، ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں۔ پرانی حویلی۔ وہ حویلی جس کے بارے میں محلے میں سو طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔

”نواب ذوالفقار علی خان کی حویلی، ”دادا ابو نے سرگوشی کی۔“ اسی سال پہلے... میں وہاں چوکیدار تھا۔ اور... ”وہ رک گئے۔“ بس اتنا سمجھ لو۔ وہاں جو کچھ ہے، وہ تمہارے لیے نہیں ہے۔“

اس رات حمزہ سو نہ سکا۔ اس کے تکیے کے نیچے وہ پھٹا ہوا کاغذ چھپا تھا۔ اس نے وعدہ تو کر لیا تھا، مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ دادا ابو کچھ چھپا رہے ہیں۔ کچھ بہت بڑا۔ اور وہ شعر اس کے ذہن میں گونج رہا تھا: ”جو مجھے جوڑے، وہی راز پاتا ہے۔“

اس رات حمزہ نے کروٹیں بدلتے ہوئے سوچا کہ دادا ابو نے اس سے وعدہ کیوں لیا تھا۔ بچپن میں دادا ابو اسے کہانیاں سناتے تھے۔ پرانے شہر کی، نوابوں کی، بہادروں کی۔ مگر حویلی کا ذکر آتے ہی وہ ہمیشہ خاموش ہو جاتے تھے۔ ایک بار حمزہ نے پوچھا تھا: ”دادا ابو، پرانی حویلی میں بھوت ہیں؟“ تو دادا ابو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا: ”بھوت نہیں بیٹا، یادیں ہیں۔ اور یادیں کبھی کبھی بھوتوں سے زیادہ ڈراؤنی ہوتی ہیں۔“

اب حمزہ سمجھنے لگا تھا کہ ان الفاظ کے پیچھے کوئی گہرا دکھ چھپا تھا۔ دادا ابو کی آنکھوں میں وہ خوف... وہ صرف ڈر نہیں تھا۔ وہ شرمندگی بھی تھی، جیسے انہوں نے کوئی وعدہ توڑا ہو۔ یا کوئی وعدہ نبھانے میں ناکام رہے ہوں۔

”نواب صاحب کی امانت،“ حمزہ نے اندھیرے میں سرگوشی کی۔ لفافے پر یہی لکھا تھا۔ امانت... کس کی امانت؟ اور دادا ابو اس کے این کیسے بنے؟

اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ سچ جان کر رہے گا۔ مگر اکیلا نہیں۔ عربہ اور عثمان کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ عربہ کی ذہانت اور عثمان کی وفاداری۔ یہی اس کی طاقت تھے۔

اگلی صبح اسکول میں حمزہ نے اپنے دو سب سے اچھے دوستوں کو سب کچھ بتا دیا۔ عربہ۔ پندرہ سال کی تیز ذہن لڑکی جو پہیلیاں حل کرنے میں پورے اسکول میں مشہور تھی۔ اور عثمان۔ سولہ سال کا محتاط مگر وفادار دوست جو ہر مہم میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

”دکھاؤ! دکھاؤ وہ کاغذ!“ عربہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

لن چ بریک میں تینوں اسکول کی چھت پر چھپ کر بیٹھ گئے۔ حمزہ نے احتیاط سے وہ پھٹا ہوا کاغذ نکالا۔ عربہ نے اسے غور سے دیکھا، پھر شعر کو دو تین بار پڑھا۔

”نہ میں بولتا ہوں، نہ میں چلتا ہوں... پھر بھی ہر راہی کو منزل دکھاتا ہوں...“
 عربیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو نقشے کی تعریف ہے! نقشہ نہ بولتا ہے نہ چلتا
 ہے، مگر منزل دکھاتا ہے۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی پورا ہوں‘۔ یہ کاغذ خود
 ایک پھٹا ہوا ٹکڑا ہے! مطلب... یہ شعر خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے
 کہ یہ نقشے کا ایک ٹکڑا ہے، اور پورا نقشہ کہیں اور ہے!“

”واہ!“ عثمان نے کہا۔ ”تو مطلب یہ کہ پورا نقشہ ملے تو خزانے کا پتا چلے گا؟“
 ”اور جو مجھے جوڑے، وہی راز پاتا ہے‘۔ مطلب ہمیں نقشے کے باقی ٹکڑے
 ڈھونڈنے ہوں گے،“ عربیہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”حمزہ، تمہارے دادا ابو
 نے کہا وہ حویلی کے چوکیدار تھے؟ تو یقیناً باقی ٹکڑے بھی حویلی میں ہی ہوں
 گے!“

”مگر دادا ابو نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں وہاں نہیں جاؤں گا،“ حمزہ نے کہا،
 مگر اس کی آواز میں وہ یقین نہیں تھا۔

عربیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”حمزہ، تمہارے دادا ابو ڈرے ہوئے
 ہیں۔ مگر سوچو۔ اگر یہ واقعی کوئی خطرناک چیز ہوتی تو وہ اسے صندوق میں رکھ کر
 کیوں رکھتے؟ انہوں نے اسے سنبھال کر رکھا ہے، مطلب یہ اہم ہے۔ اور ہو
 سکتا ہے... ہو سکتا ہے وہ صرف تمہاری حفاظت کرنا چاہتے ہوں۔ مگر ہم
 محتاط رہیں گے۔ ہم صرف دیکھنے جائیں گے، کچھ نہیں چھوئیں گے۔“

عثمان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر وہاں واقعی کوئی خزانہ ہوا تو؟“

تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو ہر بڑی مہم سے پہلے ہوتی ہے۔ خوف اور تجسس کا امتزاج۔

”ٹھیک ہے،“ حمزہ نے آخر کار کہا۔ ”کل اتوار ہے۔ صبح سویرے۔ ہم حویلی جائیں گے۔ مگر ایک شرط پر۔ ہم تینوں ساتھ رہیں گے، کوئی اکیلا کہیں نہیں جائے گا۔ اور اگر کچھ عجیب لگا تو فوراً واپس۔“

”پکا!“ عربہ اور عثمان نے ایک ساتھ کہا۔

مگر ان تینوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کی یہ بات کوئی اور بھی سن رہا تھا۔ چھت کے دروازے کے چپھے ایک سایہ دبکا ہوا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک چالاک مسکراہٹ تھی۔

اتوار کی صبح پانچ بجے کا الارم بجتا تو حمزہ ایک چھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ آسمان صاف تھا، بارش کے بعد کی وہ تازگی ہوا میں تھی جو صرف برسات کی صبحوں میں محسوس ہوتی ہے۔ اس نے جلدی سے کپڑے بدلے، کندھے پر ایک چھوٹا سا بیگ لٹکایا جس میں ٹارچ، پانی کی بوتل، رسی کا ایک ٹکڑا اور وہ پھٹا ہوا نقشہ احتیاط سے پلاسٹک کی تھیلی میں رکھا تھا۔

امی ابو سو رہے تھے۔ حمزہ نے چپکے سے پرچی لکھی: ”دوستوں کے ساتھ پارک گیا ہوں، ناشتے تک واپس۔“ یہ پورا سچ نہیں تھا، مگر پورا جھوٹ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل کو یہی تسلی دی۔

چھ بجے تینوں پرانی آبادی کے موڑ پر ملے۔ عریبہ نے ایک نوٹ بک اور پینسل پکڑی ہوئی تھی، عثمان کے پاس اس کے ابو کا پرانا ٹارچ تھا اور حمزہ کے بیگ میں نقشے کا ٹکڑا۔

”تیار ہو؟“ حمزہ نے پوچھا۔

”پیدا ہی اسی دن کے لیے ہوئی تھی،“ عریبہ نے مسکرا کر کہا، مگر اس کی آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔

وہ تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے حویلی کی طرف بڑھے۔ جوں جوں وہ قریب آتے گئے، گھروں کی بھیڑ کم ہوتی گئی اور ایک عجیب سی خاموشی چھانے لگی۔ آخر کار وہ ایک بڑے سے خالی میدان کے کنارے پہنچے۔ اور سامنے تھی وہ: پرانی حویلی۔

حمزہ کی سانس رک گئی۔

حویلی کسی سوتے ہوئے دیو کی طرح میدان کے بچوں بیچ کھڑی تھی۔ اس کی دیواریں کبھی سفید رہی ہوں گی، مگر اب وقت نے انہیں زرد اور جگہ جگہ سے

کالی کر دیا تھا۔ اونچی میناریں آسمان کو چھو رہی تھیں، جن پر کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ بڑا سامر کزی دروازہ۔ لکڑی کا، پیتل کی کیلوں سے جڑا۔ زنگ آلود زنجیروں سے بند تھا۔ دیواروں پر بیل بوٹے رینگ رہے تھے، اور کھرکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے اندر کا اندھیرا جھانک رہا تھا۔

”اللہ...“ عثمان نے سرگوشی کی۔ ”یہ تو فلموں والی حویلی لگتی ہے۔“

”تمہیں اس کی تاریخ پتا ہے؟“ عربہ نے کہا، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”میں نے کل رات انٹرنیٹ پر پڑھا۔ نواب ذوالفقار علی خان۔ اس شہر کے سب سے امیر نوابوں میں سے ایک۔ اسی سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کہتے ہیں انہوں نے اپنی ساری دولت کہیں چھپا دی تھی، اور ان کے رشتہ دار آج تک اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ حویلی پر مقدمہ چل رہا ہے۔ کوئی بلڈر اسے گرا کر یہاں پلازہ بنانا چاہتا ہے، مگر عدالت نے روک رکھا ہے۔“

”اسی سال،“ حمزہ نے آہستہ سے کہا۔ ”دادا ابو نے کہا تھا وہ یہاں چوکیدار تھے... اسی سال پہلے۔“

تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھیلی کے ٹکڑے جڑنے لگے تھے۔

”چلو،” حمزہ نے کہا۔ ”پچھلی طرف سے۔ دادا ابو نے ایک بار بتایا تھا کہ حویلی کے پچھواڑے میں ایک چھوٹا دروازہ ہے۔ نوکروں کے لیے۔“

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پچھلی طرف پہنچے۔ واقعی، بیل بوٹوں کے چھپے ایک چھوٹا سا لکڑی کا دروازہ تھا۔ اتنا چھوٹا کہ صرف جھک کر گزرا جاسکتا تھا۔ اس پر تالا نہیں تھا، بس ایک کنڈی لگی تھی جو زنگ سے گل چکی تھی۔ حمزہ نے دھکا دیا تو دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

اندر گہپ اندھیرا تھا۔ عثمان نے ٹارچ جلائی۔ روشنی میں ایک لمبا برآمدہ نظر آیا۔ فرش پر دھول کی موٹی تہ، دیواروں پر پرانے فانوس جن میں مکڑیوں نے جالے بن رکھے تھے۔ ہوا میں نمی اور پرانی لکڑی کی بو تھی۔

”یاد رکھو،” حمزہ نے سرگوشی کی۔ ”ساتھ رہنا ہے۔“

وہ دبے پاؤں آگے بڑھے۔ برآمدہ ایک بڑے صحن میں کھلتا تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ ایک خشک فوارہ تھا، اس کے گرد سنگ مرمر کے ستون۔ دیواروں پر نقش و نگار۔ کہیں مور، کہیں پھول، کہیں عربی خطاطی۔ ایک دیوار پر ایک بڑی سی تختی لگی تھی جس پر لکھا تھا:

”علم امانت ہے، امانت وقار ہے“

”یہ نواب صاحب کا قول ہوگا،“ عربیہ نے نوٹ بک میں لکھتے ہوئے کہا۔

اچانک حمزہ رک گیا۔ صحن کے دوسری طرف ایک اور دروازہ تھا۔ اندرونی حصے کی طرف جاتا ہوا۔ مگر یہ دروازہ عجیب تھا۔ اس پر کوئی تالا یا کنڈی نہیں تھی۔ اس کی لکڑی پر ایک گول دائرہ بنا ہوا تھا، اور دائرے کے نیچوں بیچ ایک چوکور خانہ۔ بالکل اس سائز کا جتنا ان کے پاس نقشے کا ٹکڑا تھا۔

”دیکھو!“ حمزہ نے کہا۔ ”یہ... یہ تو نقشے کے ٹکڑے کی جگہ لگتی ہے!“

تینوں دروازے کے گرد جمع ہو گئے۔ عثمان نے ٹارچ کی روشنی دائرے پر ڈالی۔ دائرے کے گرد باریک حروف میں کچھ لکھا تھا۔ عربیہ نے پڑھا:

”جو مجھے جوڑے، وہی آگے بڑھے“

”یہ وہی بات ہے جو شعر میں تھی!“ عربیہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”حمزہ، نقشے کا ٹکڑا نکالو!“

حمزہ نے کانپتے ہاتھوں سے پلاسٹک کی تھیلی سے وہ پھٹا ہوا کاغذ نکالا۔ اس نے اسے چوکور خانے میں رکھا۔ اور وہ بالکل فٹ بیٹھ گیا، جیسے اسی کے لیے بنایا گیا ہو۔

ایک لمحے کو کچھ نہیں ہوا۔ پھر... ایک ہلکی سی ”کٹ“ کی آواز آئی۔ دائرہ آہستہ آہستہ گھومنے لگا۔ دروازے کے اندر کہیں کوئی میکانزم چل پڑا۔ پرانی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کی آواز۔ اور پھر دروازہ خود بخود کھلنے لگا، اندر کی طرف۔

”یا اللہ...“ عثمان کی آواز لرز رہی تھی۔ ”یہ تو... یہ تو جادو ہے۔“

”جادو نہیں، میکانزم ہے،“ عربیہ نے کہا، مگر اس کی اپنی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ ”نواب صاحب نے یہ دروازہ ایسے بنوایا تھا کہ صرف وہی کھول سکے جس کے پاس نقشے کا ٹکڑا ہو۔ حمزہ... تمہارے دادا ابو کے پاس یہ ٹکڑا کیوں تھا؟“

حمزہ کے ذہن میں دادا ابو کی خوفزدہ آنکھیں گھوم گئیں۔ ”پتا نہیں... مگر اب ہم اندر جا رہے ہیں۔ ٹارچ آگے کرو، عثمان۔“

دروازے کے پار ایک کمرہ تھا۔ یا شاید ایک ہال۔ ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے دیکھا کہ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں۔ نوابوں کی، پگڑیوں والے بزرگوں کی۔ ایک کونے میں ایک میز تھی، اس پر ایک چراغ اور کچھ کتابیں۔ سب دھول میں اٹے ہوئے۔ فرش پر ایک پرانا قالین بچھا تھا جس کا رنگ اب پہچانا نہیں جاتا تھا۔

”یہ تو... یہ تو ایسے لگتا ہے جیسے کوئی ابھی کل یہاں سے گیا ہو،“ عربیہ نے کہا۔ ”بس دھول نے سب ڈھک دیا ہے۔“

دروازے کے پار وہ ایک لمبے ہال میں داخل ہوئے۔ عثمان نے ٹارچ کی روشنی چاروں طرف گھمائی اور تینوں کی سانسیں رک گئیں۔

یہ کوئی عام کمرہ نہیں تھا — یہ ایک عجائب گھر تھا۔ دیواروں پر قطار در قطار تصویریں لگی تھیں: گھوڑوں پر سوار نواب، شکار کے مناظر، پرانی دہلی کی گلیاں۔ ایک دیوار پر تلواریں اور ڈھالیں سجی تھیں، جن پر دھول کی موٹی تہہ جمی تھی مگر ان کی دھار اب بھی چمک رہی تھی۔ کمرے کے نیچوں بیچ ایک بڑا سا فانوس لٹک رہا تھا۔ سینکڑوں کرسٹل کے ٹکڑوں والا — جو ٹارچ کی روشنی میں ہیرے کی طرح چمک اٹھا۔

”یہ... یہ سب اصلی ہے؟“ عثمان نے سرگوشی کی۔ ”یہ تلواریں... یہ تصویریں... ان کی قیمت کروڑوں میں ہوگی!“

”چھونا مت!“ عربیہ نے فوراً کہا۔ ”ڈائری میں لکھا تھا — جو لالچ لے کر آئے گا۔ ہم یہاں چوری کرنے نہیں آئے۔ ہم صرف راز جاننے آئے ہیں۔“

حمزہ نے اثبات میں سر ہلایا، مگر اس کی نظریں ایک کونے میں رکھی چھوٹی سی میز پر جم گئیں۔ اس پر ایک موسیقی کا ڈبہ رکھا تھا — پیتل کا، نقش و نگار والا۔ اس نے احتیاط سے اس کا ڈھکن کھولا۔ ایک لمحے کو کچھ نہیں ہوا، پھر... ایک مدھم سی دھن بجنے لگی۔ پرانی، اداس دھن — جیسے کوئی سوئے ہوئے وقت کو جگا رہا ہو۔

تینوں ساکت کھڑے سنتے رہے۔ دھن میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ عربیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”کیا خوبصورت ہے،“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سوچو۔ اسی سال پہلے کوئی اسے سنتا ہوگا۔ شاید نواب صاحب خود۔ شاید... ان کے بچے؟“

”ان کی کوئی اولاد نہیں تھی،“ حمزہ نے کہا۔ ”عربہ نے بتایا تھا۔“

”ہاں، مگر...“ عربہ نے موسیقی کے ڈبے کو غور سے دیکھا۔ اس کے نیچے ایک چھوٹی سی تختی تھی جس پر لکھا تھا: ”میری بیٹی کے لیے۔“ وہ چونک گئی۔ ”دیکھو! میری بیٹی کے لیے۔“ تو نواب صاحب کی کوئی بیٹی تھی؟ یا... ہونے والی تھی؟“

یہ ایک نیا معمہ تھا۔ حمزہ کے ذہن میں سوالات گھومنے لگے۔ اس نے ڈبہ بند کر دیا۔ دھن آہستہ آہستہ مدھم ہو کر ختم ہو گئی، جیسے کوئی سو گیا ہو۔

عثمان ایک الماری کے پاس کھڑا پرانے اخبارات دیکھ رہا تھا۔ ”دیکھو یہ!“ اس نے ایک اخبار اٹھایا۔ سرخی تھی: ”نواب ذوالفقار علی خان کا انتقال۔“ شہر سوگوار۔ ”تاریخ... اسی سال پہلے کی۔“ اس نے اگلا اخبار اٹھایا: ”نواب کی جائیداد پر تنازع۔ رشتہ داروں کا دعویٰ۔“ اور ایک اور: ”حویلی سیل۔ عدالت کا حکم۔“

”یہ سب... یہ سب اسی زمانے کا ہے،“ عثمان نے کہا۔ ”جیسے وقت یہیں رک گیا ہو۔“

عربیہ دیوار پر لگی تختی کے پاس کھڑی تھی۔ وہی جس پر لکھا تھا ”علم امانت ہے، امانت وقار ہے۔“ اس نے نوٹ بک میں لکھا، پھر بولی: ”سوچو۔ نواب صاحب نے اپنی دولت چھپائی، مگر دیوار پر یہ لکھوایا۔ علم امانت ہے۔ مطلب ان کے لیے سب سے قیمتی چیز علم تھا۔ تو خزانہ... شاید کتابیں ہوں؟ نایاب مخطوطات؟“

”یا سونا بھی ہو اور کتابیں بھی،“ حمزہ نے کہا۔ ”ڈائری پڑھتے ہیں۔ شاید اس میں جواب ہو۔“

حمزہ میز کی طرف بڑھا۔ کتابوں میں سے ایک کھلی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی اسے پڑھتے پڑھتے اٹھ کر چلا گیا ہو۔ اس نے کتاب اٹھائی۔ وہ ایک ڈائری تھی۔ چمڑے کی جلد والی۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا: ”ذوالفقار علی خان۔ ذاتی۔“

”نواب صاحب کی ڈائری!“ حمزہ نے کہا۔

اس نے ورق پلٹا۔ سیاہی مدھم پڑ چکی تھی، مگر پڑھی جا سکتی تھی۔ پہلی سطریں:

”آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میری دولت میرے مرنے کے بعد ان ہاتھوں میں نہیں جائے گی جو اسے عیاشی میں اڑا دیں گے۔ میں نے ایک سلسلہ بنایا

ہے۔ پھیلیوں کا۔ جو عقل، ہمت اور سچائی سے کام لے گا، وہی میری امانت کا
حقدار ہوگا۔ پہلی پھیلی کا جواب تمہارے پاس ہے، اگر تم یہ پڑھ رہے ہو...”

“آگے پڑھو!” عربہ نے بے تابی سے کہا۔

حمزہ نے اگلا ورق پلٹا۔ سیاہی یہاں زیادہ مدھم تھی، جیسے لکھنے والے کا ہاتھ
کانپ رہا ہو:

“میری زندگی کے آخری دن قریب ہیں۔ میرے رشتہ دار گدھوں کی طرح میری
موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر میں انہیں اپنی دولت نہیں دوں گا۔ وہ دولت
جو میں نے اس شہر کے غریبوں کے لیے رکھی ہے۔ میں نے تین دروازے
بنائے ہیں، تین پھیلیاں رکھی ہیں۔ پہلا دروازہ وہی کھول سکتا ہے جس کے
پاس نقشے کا پہلا ٹکڑا ہو۔ دوسرا دروازہ اس کے لیے ہے جو خوف پر قابو پائے۔
اور تیسرا... تیسرا صرف وہی کھول سکتا ہے جس کا دل صاف ہو۔

یاد رکھو۔ خزانہ سونا چاندی نہیں۔ خزانہ وہ ہے جو نسلوں تک کام آئے۔ اور
ہاں، ایک بات اور: میری حویلی میں صرف پھیلیاں نہیں، پہرے دار بھی ہیں۔
جو لالچ لے کر آئے گا، وہ خالی ہاتھ جائے گا۔ یا شاید واپس ہی نہ جاسکے۔”

تینوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

“پہرے دار؟” عثمان نے حلق خشک کرتے ہوئے کہا۔ “مطلب... بھوت؟”

”بھوت نہیں ہوتے،“ عربیہ نے کہا، مگر اس بار اس کی آوازیں وہ یقین نہیں تھا جو عام طور پر ہوتا تھا۔ ”شاید کوئی میکانزم ہو۔ جال۔ نواب صاحب نے لکھا ہے، جو لالچ لے کر آئے گا۔“ مطلب ہمیں لالچ نہیں کرنا چاہیے۔“

حمزہ نے ڈائری بند کی اور اسے احتیاط سے میز پر واپس رکھ دیا۔ اس کی نظریں کمرے میں گھومنے لگیں۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک دیوار پر ایک بڑا سا نقش بنا ہوا تھا۔ حویلی کا خاکہ! اس میں تین جگہوں پر سرخ نشان لگے تھے: ایک داخلی دروازے پر، ایک تہ خانے کی طرف، اور ایک چھت پر۔

”دیکھو!“ حمزہ نے کہا۔ ”یہ حویلی کا خاکہ ہے! اور یہ سرخ نشان — شاید یہی وہ تین دروازے ہیں جن کا ذکر ڈائری میں ہے!“

عربیہ نے جلدی سے نوٹ بک نکالی اور خاکے کی نقل اتارنے لگی۔ ”پہلا دروازہ ہم کھول چکے۔ دوسرا تہ خانے میں... اور تیسرا چھت پر۔“

”تہ خانہ؟“ عثمان کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے ہمیں نیچے جانا ہوگا؟ اندھیرے میں؟“

”ابھی نہیں،“ حمزہ نے کہا۔ ”پہلے یہ کمرہ دیکھ لیں۔“

وہ کمرے میں پھیل گئے۔ عثمان تصویروں کو دیکھنے لگا۔ ایک تصویر میں نواب ذوالفقار علی خان خود تھے: بھاری مونچھیں، سر پر پگڑی، آنکھوں میں ایک عجیب

سی چمک۔ ان کے چپھے کھڑا ایک نوجوان نوکر... حمزہ نے غور سے دیکھا۔ وہ چہرہ کہیں دیکھا ہوا لگتا تھا۔ جیسے... جیسے دادا ابو کی جوانی کی تصویر!

حمزہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ ہاں... وہی ناک، وہی آنکھیں۔ یہ نوکر... یہ دادا ابو تھے! جوانی میں!

”عربیہ... عثمان...“ حمزہ کی آواز لرز رہی تھی۔ ”یہ دیکھو۔ یہ نوکر... یہ میرے دادا ابو ہیں۔“

”کیا؟“ دونوں دوڑ کر آئے۔

”مطلب تمہارے دادا ابو صرف چوکیدار نہیں تھے،“ عربیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ نواب صاحب کے خاص ملازم تھے۔ اسی لیے ان کے پاس نقشے کا ٹکڑا تھا۔ اسی لیے وہ ڈرے ہوئے ہیں۔ حمزہ... تمہارا خاندان اس راز سے جڑا ہوا ہے۔“

حمزہ کے ذہن میں دادا ابو کی بات گونجنے لگی: ”کچھ دروازے کبھی نہیں کھولنے چاہئیں۔“

”حمزہ!“ عربیہ کی آواز آئی۔ وہ ایک الماری کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے دروازے پر ایک چھوٹی سی تختی لگی تھی جس پر لکھا تھا:

”جب سورج آسمان کے نیچ ہو، میرا سایہ میرے قدموں میں ہو اس سانے کی نوک جہاں تھے، وہاں زمین اپنا سینہ کھولے“

”یہ دوسری پہیلی ہے!“ عربیہ نے کہا۔ ”سورج جب سر پر ہو۔ دوپہر کے بارہ بجے۔ سایہ قدموں میں ہوتا ہے۔ صحن میں جو خشک فوارہ ہے، اس کے ستون کا سایہ دوپہر کو جہاں گرے گا۔ وہیں تہہ خانے کا دروازہ ہوگا!“

”تو ہمیں دوپہر تک انتظار کرنا ہوگا؟“ عثمان نے پوچھا۔

”یا...“ عربیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یا ہم ابھی تہہ خانے کا راستہ ڈھونڈیں۔ نقشے کے خاکے میں تہہ خانے کا نشان...“

مگر اسی لمحے۔ اوپر کی منزل سے ایک آواز آئی۔

ٹھک... ٹھک... ٹھک...

کسی کے قدموں کی آہٹ۔ واضح، بھاری، اور ان کی طرف بڑھتی ہوئی۔

تینوں ساکت ہو گئے۔ عثمان نے ٹارچ بجھا دی۔ اندھیرے میں صرف ان کی سانسوں کی آواز تھی۔ اور وہ قدم... جو سیرڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔

کوئی اور بھی حویلی میں تھا۔ اوپر کی منزل سے ایک آواز آئی۔

ٹھک... ٹھک... ٹھک...

کسی کے قدموں کی آہٹ۔ واضح، بھاری، اور ان کی طرف بڑھتی ہوئی۔
تینوں ساکت ہو گئے۔ عثمان نے ٹارچ بجھا دی۔ اندھیرے میں صرف ان کی
سانسوں کی آواز تھی۔ اور وہ قدم... جو سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔
کوئی اور بھی حویلی میں تھا۔

قدموں کی آہٹ قریب آتی گئی... اور پھر اچانک رک گئی۔

تینوں اندھیرے میں ساکت کھڑے تھے۔ حمزہ کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے لگا وہ آواز باہر تک سنائی دے رہی ہوگی۔ عثمان نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ لمبینے سے بھیگا ہوا تھا۔ عربہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

پھر ایک اور آواز آتی — اس بار نیچے سے نہیں، بلکہ ان کے بالکل قریب سے۔
کھڑکی کے پاس۔

”میاؤں!“

تینوں نے بے اختیار سانس چھوڑی۔ ایک بلی تھی — کالی بلی، کھڑکی کی ٹوٹی ہوئی جالی سے اندر آتی تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر بھی نہ ڈری، بس اپنی دم ہلاتی ہوئی میز کے نیچے گھس گئی۔

”بلی تھی!“ عثمان نے سرگوشی میں کہا، اس کی آوازیں راحت اور شرمندگی دونوں تھے۔ ”ہم بلی سے ڈر گئے!“

”مگر قدموں کی آہٹ...“ حمزہ نے کہا۔ ”وہ بلی نہیں تھی۔ وہ سیرھیوں سے آ رہی تھی۔“

عربیہ نے ٹارچ جلائی اور سیرھیوں کی طرف بڑھی۔ تینوں دبے پاؤں اوپر گئے۔ اوپر کا ہال خالی تھا۔ دھول، جالے، ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں۔ مگر... عربیہ رک گئی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی فرش پر ڈالی۔

دھول میں قدموں کے نشان تھے۔ تازہ نشان۔

”دیکھو،“ اس نے کہا۔ ”یہ نشان... یہ ہمارے نہیں ہیں۔ ہمارے جوتوں کے نشان اس طرف ہیں۔ یہ کسی اور کے ہیں۔ اور یہ تازہ ہیں۔ دھول ابھی بیٹھی نہیں ان پر۔“

حمزہ نے غور سے دیکھا۔ نشان بڑے تھے۔ کسی مرد کے جوتوں کے۔ اور وہ سیرھیوں کی طرف جا رہے تھے... پھر واپس۔ جیسے کوئی آیا ہو، کچھ دیکھا ہو، اور چلا گیا ہو۔

”مطلب کوئی یہاں آیا تھا،“ حمزہ نے کہا۔ ”آج۔ یا کل۔“

عثمان نے ایک کونے میں کچھ چمکتا ہوا دیکھا۔ اس نے اٹھایا۔ ایک ٹارچ تھی۔ جدید، مہنگی ٹارچ۔ اس پر ایک نام لکھا تھا: ”ایف۔“

”کسی کی ٹارچ گر گئی،“ عثمان نے کہا۔ ”ایف... کس کا نام ‘ایف’ سے شروع ہوتا ہے؟“

تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کے اسکول میں ‘ایف’ سے ایک ہی مشہور نام تھا۔ فہد۔ فہد۔ فہد ملک۔ امیر باپ کا بیٹا، جو ہر چیز پر اپنا حق سمجھتا تھا۔

”فہد؟“ عربیہ نے کہا۔ ”وہ یہاں کیا کر رہا ہوگا؟“

”یاد ہے چھت پر...“ حمزہ نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے لگا تھا کوئی ہماری بات سن رہا ہے۔“

خاموشی چھا گئی۔ پھر عربیہ نے مضبوط لہجے میں کہا: ”جو بھی ہو، ہم ڈریں گے نہیں۔ ہمارے پاس نقشے کا ٹکڑا ہے، ہمارے پاس ڈائری کی معلومات ہیں۔ اور ہمیں دوپہر کے بارہ بجے کا انتظار کرنا ہے۔ سائے والی پہیلی کے لیے۔ ابھی... ابھی نو بجے ہیں۔ تین گھنٹے ہیں۔ ہم اس وقت میں حویلی کو اور دیکھتے ہیں۔ مگر ہوشیار رہنا۔ اگر فہد یہاں ہے تو وہ اکیلا نہیں ہوگا۔“

وہ نیچے واپس آئے۔ حمزہ نے نقشے کا خاکہ دوبارہ دیکھا۔ تہ خانے کا نشان صحن کے نیچے تھا۔ ”چلو صحن چلتے ہیں۔ فوارے کے پاس۔ شاید وہاں کوئی اور اشارہ ملے۔“

صحن میں دھوپ پھیل رہی تھی۔ خشک فوارہ نیچوں نیچ کھڑا تھا۔ سنگ مرمر کا، اس پر موروں کے نقش۔ اس کے گرد چار ستون تھے۔ حمزہ نے ایک ستون کو چھوا۔ ٹھنڈا، کھردرا۔

”دوپہر کو اس ستون کا سایہ...“ عریبہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”سورج سر پر ہوگا تو سایہ چھوٹا ہوگا، ستون کے قدموں میں۔ پھر جیسے جیسے سورج ڈھلے گا، سایہ لمبا ہوگا۔ پہیلی میں کہا گیا ہے، اس سائے کی نوک جہاں تھے، تھے؟ مطلب سایہ رک جائے؟“

”شاید اس کا مطلب ہے جہاں سایہ سب سے چھوٹا ہو۔ دوپہر کے عین بارہ بجے،“ حمزہ نے کہا۔ ”اس وقت سائے کی نوک جس جگہ ہوگی، وہیں...“

”وہیں زمین اپنا سینہ کھولے گی،“ عریبہ نے مکمل کیا۔ ”یعنی تہہ خانے کا دروازہ۔ ہمیں بارہ بجے یہیں ہونا چاہیے۔“

عثمان نے فوارے کے اندر جھانکا۔ خشک تالاب میں پتے اور مٹی جمع تھی۔ اس نے ایک پتہ ہٹایا تو نیچے کچھ چمکا۔ ایک سکھ! پرانا، تانبے کا سکھ۔ اس پر عربی میں کچھ لکھا تھا۔

”دیکھو!“ اس نے سکھ اٹھایا۔ ”یہ تو... یہ تو نواب صاحب کے زمانے کا لگتا ہے!“

”رکھ لو، ”حمزہ نے کہا۔ “یہ ہماری پہلی... یادگار ہے۔“

مگر عربیہ کی نظریں کہیں اور تھیں۔ وہ صحن کے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ بڑے بڑے پتھروں کا فرش، مگر کچھ پتھر دوسروں سے مختلف تھے۔ ان پر حروف کندہ تھے۔

”حمزہ... عثمان... یہ دیکھو۔“

وہ ایک لمبی راہداری کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو صحن سے تہہ خانے کی سمت جاتی تھی۔ اس کے فرش پر قطار در قطار پتھر لگے تھے، اور ہر پتھر پر ایک لفظ کندہ تھا: علم، دولت، امانت، اللچ، وقار، طاقت، وفا، دھوکہ...
”یہ... یہ کوئی کھیل لگتا ہے،“ عثمان نے کہا۔

”نہیں،“ عربیہ کی آواز سنجیدہ تھی۔ ”یہ جال ہے۔ ڈائری میں لکھا تھا۔ دوسرا دروازہ اس کے لیے ہے جو خوف پر قابو پائے۔ اور نواب صاحب کا قول... علم امانت ہے، امانت وقار ہے۔‘ شاید صحیح راستہ وہی ہے جو اس قول کے الفاظ پر چلے۔“

تینوں راہداری کے دبانے پر کھڑے تھے۔ سامنے تقریباً بیس قدم لمبی راہداری تھی، اس کا فرش ان کندہ پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ دیواروں پر مشعلیں لگی

تھیں۔ بجھی ہوئی، مگر ان کے نیچے کالک کے نشان تھے، جیسے کبھی یہاں روشنی ہوتی تھی۔

”سنو،“ عربیہ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ صرف ان پتھروں پر قدم رکھنا محفوظ ہے جن پر نواب صاحب کے قول کے الفاظ ہیں۔ علم، امانت، وقار۔ باقی پتھر... جال ہو سکتے ہیں۔“

”اور اگر تم غلط ہوئی تو؟“ عثمان نے پوچھا۔

عربیہ نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اسے ”دولت“ والے پتھر پر پھینکا۔

ایک لمحے کو کچھ نہیں ہوا۔ پھر... دیوار میں سے ایک تیر نکل کر سامنے والی دیوار میں دھنس گیا! تیر کی نوک زہر میں بجھی ہوئی لگتی تھی۔ یا شاید صرف زنگ آلود تھی۔

”یا اللہ!“ عثمان چپھے ہٹ گیا۔ ”یہ تو واقعی جان لیوا ہے!“

”میں صحیح تھی،“ عربیہ نے کہا، اس کی سانس تیز چل رہی تھی۔ ”دولت“ اور ’لچ‘ والے پتھر جال ہیں۔ صرف ’علم‘، ’امانت‘، ’وقار‘۔ اور شاید ’وفا‘۔ محفوظ ہیں۔ نواب صاحب کا پیغام صاف ہے: جو علم اور امانت کے راستے پر چلے گا، وہی آگے بڑھے گا۔ جو دولت اور لچ کے چپھے جائے گا...“

”وہ تیر کھائے گا،“ حمزہ نے مکمل کیا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں پہلے جاتا ہوں۔ تم دونوں میرے قدموں پر قدم رکھنا۔“

”نہیں!“ عربیہ نے کہا۔ ”میں نے پہیلی حل کی ہے، میں جاؤں گی پہلے۔ تم میرے پیچھے آؤ۔“

اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ عربیہ کی ضد مشہور تھی۔ اس نے پہلا قدم ”علم“ والے پتھر پر رکھا۔ کچھ نہیں ہوا۔ پھر ”امانت“ پر۔ پھر ”وقار“ پر۔ ہر قدم کے ساتھ تینوں کی سانسیں رک جاتیں۔

آٹھویں قدم پر عربیہ رک گئی۔ سامنے دو پتھر تھے۔ ”وفا“ اور ”طاقت“۔ قول میں ”وفا“ نہیں تھا۔ مگر... ”طاقت“ تو یقیناً جال تھا۔

”وفا“، ”اس نے فیصلہ کیا۔“ نواب صاحب نے ڈائری میں لکھا تھا۔ ’جو عقل، ہمت اور سچائی سے کام لے گا۔‘ وفا سچائی کا حصہ ہے۔“

اس نے ”وفا“ پر قدم رکھا۔ خاموشی۔ محفوظ۔

اسی طرح وہ آگے بڑھتے گئے۔ علم، امانت، وقار، وفا، علم، امانت... ہر قدم ایک امتحان تھا۔ عثمان کے ماتھے پر پسینہ تھا، حمزہ کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ آخری تین قدم باقی تھے جب... عثمان کا پاؤں بھسل گیا۔

اس کا جوتا ”لالچ“ والے پتھر کے کنارے کو چھو گیا۔

”عثمان! حمزہ چلایا۔

دیوار میں سے ایک بھاری پتھر نیچے گرنے کی آواز آئی۔ ایک گول پتھر، انسانی سر جتنا بڑا، راہداری کی چھت سے لڑھکتا ہوا ان کی طرف آنے لگا!

”بھاگو!“ عربہ چلائی۔

تینوں نے چھلانگ لگائی۔ علم، امانت، وقار۔ اور راہداری کے دوسرے سرے پر جا گرے۔ گول پتھر ان کے پیچھے دیوار سے ٹکرا کر چور چور ہو گیا۔ پتھروں کے ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔

کچھ دیر تک کوئی نہیں بولا۔ صرف ان کی ہانپنے کی آوازیں تھیں۔

”تم... تم ٹھیک ہو؟“ حمزہ نے عثمان سے پوچھا۔

عثمان نے سر ہلایا، مگر اس کا چہرہ سفید پڑا تھا۔ ”میں... میں نے غلطی کی۔ معاف کرنا۔“

”غلطی سب سے ہوتی ہے،“ عربہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اہم یہ ہے کہ ہم ساتھ ہیں۔ اور دیکھو۔ ہم پار کر گئے!“

راہداری کے اس پار ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک پتھر کی میز تھی، اور میز پر... ایک اور پھٹا ہوا کاغذ! نقشے کا دوسرا ٹکڑا!

”دوسرا ٹکڑا!“ حمزہ نے خوشی سے کہا۔ وہ آگے بڑھا۔ مگر عربیہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”رکو! یہ اتنا آسان نہیں ہو سکتا۔ دیکھو۔ میز کے گرد فرش...“

میز کے گرد فرش پر ایک گول دائرہ بنا ہوا تھا۔ اور دائرے کے اندر چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ جیسے نیچے سے کچھ نکل سکتا ہو۔

”ایک اور جال،“ عربیہ نے کہا۔ ”ہمیں سوچنا ہوگا۔“

حمزہ نے جیب سے دونوں ٹکڑے نکالے۔ پہلا ٹکڑا جو دادا ابو کے صندوق سے ملا تھا، اور یہ دوسرا۔ اس نے انہیں فرش پر جوڑ کر رکھا۔ وہ بالکل آپس میں ملتے تھے۔ جیسے ایک ہی تصویر کے دو حصے۔

”دیکھو!“ عربیہ نے کہا۔ ”یہ... یہ حویلی کی چھت کا نقشہ ہے! یہ گنبد... یہ میناریں... اور یہاں۔“ اس نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک ستارے کا نشان بنا تھا۔ ”یہاں کچھ ہے۔ چھت پر۔ یہی تیسرا دروازہ ہوگا!“

”اور یہ لکیر...“ عثمان نے کہا۔ ”یہ لکیر دونوں ٹکڑوں سے گزر رہی ہے۔ جیسے کوئی راستہ ہو۔“

واقعی، دونوں ٹکڑوں پر ایک مدہم لکیر بنی تھی جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ستارے تک جاتی تھی۔ عربیہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ”یہ راستہ ہے۔ پہلے

دروازے سے تیسرے دروازے تک۔ مگر درمیان کا حصہ غائب ہے۔ تیسرا ٹکڑا۔ مطلب نقشے کا ایک اور ٹکڑا کہیں ہے۔

”تیسرا ٹکڑا...“ حمزہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”دادا ابو کے پاس پہلا تھا۔ یہ دوسرا یہاں تھا۔ تو تیسرا... شاید چھت پر ہو۔ تیسرے دروازے کے پاس۔“

مگر سوچنے کا وقت نہیں ملا۔

چھپے سے ایک آواز آئی۔ راہداری کے دوسرے سرے سے۔

”واہ! کیا بات ہے! چوہے جال میں پھنس گئے!“

تینوں نے مڑ کر دیکھا۔ راہداری کے دہانے پر دو لڑکے کھڑے تھے۔ ایک... فہد۔ اور اس کے ساتھ اس کا بڑا کزن بلال۔ بیس بائیس سال کا، مضبوط جسم والا۔

”فہد! حمزہ نے کہا۔“ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

فہد مسکرایا۔ وہی مغرور مسکراہٹ جو اسکول میں سب کو چڑھتی تھی۔ ”وہی جو تم کر رہے ہو، حمزہ۔ خزانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ... یہ حویلی میرے خاندان کی ہے۔ میرے دادا نواب صاحب کے رشتہ دار تھے۔ تو تکنیکی طور پر، یہ خزانہ میرا حق ہے۔“

”جھوٹ!“ عربیہ نے کہا۔ ”عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ ابھی کسی کا حق ثابت نہیں ہوا۔“

”عدالت اپنا کام کرے، میں اپنا،“ فہد نے کہا۔ اس کی نظریں میز پر رکھے نقشے کے ٹکڑے پر تھیں۔ ”ویسے... شکریہ۔ تم تینوں نے جال پار کر کے میرا کام آسان کر دیا۔ اب وہ ٹکڑا مجھے دے دو۔“

”کبھی نہیں!“ حمزہ نے کہا۔

بلال آگے بڑھا۔ وہ حمزہ سے دگنا تھا۔ ”دیکھو بچے،“ اس نے کہا۔ ”پیار سے دے دو۔ ورنہ...“

حمزہ نے میز کی طرف دیکھا۔ ٹکڑا صرف چند قدم دور تھا۔ اس نے عربیہ کو آنکھ ماری۔ عربیہ سمجھ گئی۔

”اب!“ حمزہ چلایا۔

وہ میز کی طرف دوڑا۔ بلال بھی دوڑا۔ حمزہ نے چھلانگ لگائی۔ دائرے کے پار۔ اور ٹکڑا اٹھا لیا! مگر اسی لمحے دائرے کے سوراخوں سے دھواں نکلنے لگا۔ نیند آور دھواں!

”سائنس روکو!“ عربیہ چلائی۔

حمزہ نے ٹکڑا جیب میں ڈالا اور دائرے سے باہر چھلانگ لگائی۔ بلال دھوئیں میں کھانسنے لگا اور پیچھے ہٹ گیا۔

”یہ... یہ تمہارا آخری موقع تھا، حمزہ!“ فہد نے کھانستے ہوئے کہا۔ ”میرے ابو بلڈر ملک کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ یہ حویلی اگلے مہینے گرائی جائے گی۔ خزانہ ہمارا ہوگا۔ چاہے تم مدد کرو یا نہ کرو!“

”بلڈر ملک؟“ عربہ نے کہا۔ ”وہی جو حویلی گرا کر پلازہ بنانا چاہتا ہے؟“

فہد کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر آیا۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر رک رہا ہو۔ ”تم نہیں سمجھو گے،“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے ابو... ان کا سارا کاروبار بلڈر ملک کے ساتھ ہے۔ اگر یہ پلازہ نہ بنا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ ابو نے کہا ہے۔ خزانہ ڈھونڈو، ورنہ...“ وہ رک گیا۔

”ورنہ کیا؟“ حمزہ نے پوچھا۔

”ورنہ مجھے بورڈنگ اسکول بھیج دیں گے۔“ فہد کی آواز میں پہلی بار کمزوری تھی۔ ”میں... میں برا نہیں ہوں، حمزہ۔ میں صرف... پھنسا ہوا ہوں۔“

ایک لمحے کو حمزہ کو فہد پر ترس آیا۔ مگر پھر اسے یاد آیا۔ یہ وہی فہد ہے جو اسکول میں کمزور لڑکوں کو تنگ کرتا تھا۔ ہمدردی اور ہوشیاری میں فرق تھا۔

”تو اپنے ابو سے کہو کہ کسی اور کا حق مار کر کاروبار نہیں بچایا جاتا،“ عریبہ نے کہا۔ ”نواب صاحب نے یہ خزانہ غریبوں کے لیے رکھا تھا۔ ڈائری میں لکھا ہے۔ تم اسے چھین کر...“

”بس!“ بلال نے بات کاٹی۔ ”بہت ہو گیا لیکچر۔“

”سمجھدار ہو،“ فہد نے کہا۔ ”اب... وہ نوٹ بک دو۔“ اس کی نظر عریبہ کی نوٹ بک پر تھی۔ جس میں خاکے کی نقل اور پھیلیاں لکھی تھیں۔

”بھاگ!“ حمزہ چلایا۔

تینوں راہداری کی طرف دوڑے۔ مگر راہداری میں جال تھے! وہ محتاط قدموں سے ”علم، امانت، وقار“ پر چلتے ہوئے واپس بھاگے۔ فہد اور بلال نے ان کا پیچھا کیا۔ مگر انہیں راستہ نہیں پتا تھا۔ بلال نے ”دولت“ پر قدم رکھا اور ایک تیر اس کے کندھے کو چھو کر گزر گیا!

”آہ!“ بلال چلایا۔

”رکو! رکو!“ فہد نے بلال کو روکا۔ ”یہ جال ہے! ہمیں ان کے قدموں پر چلنا ہوگا!“

مگر تینوں پہلے ہی راہداری پار کر چکے تھے۔ وہ صحن میں نکلے اور فوارے کے چھپ چھپ گئے۔ ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

”وہ... وہ نوٹ بک...“ عربیہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔
بھاگتے ہوئے نوٹ بک گر گئی تھی۔ راہداری کے اس پار، فہد کے قریب!

”کوئی بات نہیں،“ حمزہ نے کہا، جیب سے نقشے کا دوسرا ٹکڑا نکالتے ہوئے۔
”ہمارے پاس یہ ہے۔ اور پہیلی ہمیں یاد ہے۔ بارہ بجنے میں...“ اس نے
آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج تقریباً سر پر تھا۔ ”بس کچھ منٹ باقی ہیں!“

تینوں فوارے کے پاس بیٹھ گئے۔ عثمان نے اپنی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج کر
پچپن منٹ۔ سورج بالکل سر پر تھا۔ ستون کا سایہ سکڑ کر اس کے قدموں میں
سمٹ آیا تھا۔ بالکل جیسا پہیلی میں کہا گیا تھا۔

”دیکھو!“ عربیہ نے کہا۔ ”سایہ اب سب سے چھوٹا ہے۔ اس کی نوک...
وہاں!“

سائے کی نوک صحن کے فرش کے ایک خاص پتھر پر پڑ رہی تھی۔ ایک ایسا پتھر
جو باقیوں سے تھوڑا مختلف تھا۔ اس کے کنارے پر باریک لکیر تھی، جیسے وہ
الگ سے کاٹا گیا ہو۔

حمزہ نے اس پتھر پر ہاتھ رکھا اور دھکا دیا۔ پتھر ہلا۔ اور پھر ایک طرف سرک
گیا! نیچے سیڑھیاں تھیں۔ اندھیرے میں اترتی ہوئی پتھریلی سیڑھیاں۔ ٹھنڈی
ہوا کا ایک جھونکا اوپر آیا، نمی اور مٹی کی بو لیے ہوئے۔

”تہہ خانہ،“ حمزہ نے سرگوشی کی۔ ”ہم نے کر دکھایا!“

”رکو،“ عثمان نے کہا۔ ”فہد اور بلال... وہ ابھی راہداری میں ہیں۔ وہ بھی یہ دیکھ لیں گے!“

”تو جلدی کرو،“ عربہ نے کہا۔ ”اندر چلو، اور پتھر واپس اپنی جگہ کر دو۔“

تینوں سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ عثمان نے ٹارچ جلائی۔ نیچے ایک لمبی سرنگ تھی۔ دیواریں گیلی، چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ ہر قدم پر ان کے جوتوں کی آواز گونج رہی تھی۔ سرنگ کے آخر میں ایک بھاری لکڑی کا دروازہ تھا۔

حمزہ نے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔

اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ مگر یہ کمرہ باقی حویلی سے مختلف تھا۔ یہاں دھول کم تھی، جیسے کوئی یہاں آتا جاتا ہو۔ دیوار پر ایک پرانی لالٹین لٹکی تھی۔ بجھی ہوئی، مگر اس کے شیشے صاف تھے۔ کونے میں ایک چٹائی بچھی تھی، اور اس پر... ایک چائے کا کپ! خشک چائے کی پتی اس میں جمی ہوئی تھی۔

”یہاں کوئی رہتا ہے،“ عربہ نے سرگوشی کی۔ ”یا... رہتا تھا۔ یہ چائے کا کپ یہ زیادہ پرانا نہیں لگتا۔“

عثمان نے لالین کو چھوا۔ ”گرم نہیں ہے۔ مگر...“ اس نے فرش دیکھا۔ ”یہ دیکھو۔ جوتوں کے نشان۔ وہی بڑے نشان جو اوپر تھے۔ وہ شخص یہاں بھی آیا تھا۔“

حمزہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ کوئی اس حویلی میں باقاعدگی سے آتا تھا۔ کوئی جو اندھیرے سے نہیں ڈرتا تھا۔ کوئی جو... شاید اب بھی یہیں کہیں ہو۔

”ہوشیار رہو،“ اس نے کہا۔ ”اور آواز مت نکالو۔“

کمرے کے بیچوں بیچ... ایک صندوق۔ لوہے کا صندوق، زنجیروں سے بندھا ہوا۔ اور کمرے کے بیچوں بیچ... ایک صندوق۔ لوہے کا صندوق، زنجیروں سے بندھا ہوا۔

”خزانہ!“ عثمان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”رکو!“ عربہ نے پھر کہا۔ ”یاد رکھو۔ جلد بازی میں جال ہوتا ہے۔ پہلے دیکھو۔“

انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرش خشک تھا۔ دیواروں پر کچھ نہیں تھا۔ صندوق پر کوئی جال نظر نہیں آ رہا تھا۔ حمزہ نے احتیاط سے زنجیریں ہٹائیں۔ وہ زنگ آؤد تھیں، مگر کھل گئیں۔ اس نے ڈھکن اٹھایا۔

صندوق خالی تھا۔

بالکل خالی۔ سوائے ایک لفافے کے۔

تینوں کی امیدیں ایک لمحے میں چکنا چور ہو گئیں۔ حمزہ نے لفافہ اٹھایا اور کھولا۔
اندر ایک خط تھا۔ نواب ذوالفقار علی خان کے ہاتھ سے لکھا ہوا:

”اگر تم یہ پڑھ رہے ہو تو تم نے دو دروازے پار کر لیے ہیں۔ تم بہادر ہو، ذہین ہو۔ مگر اب سچ سنو۔ خزانہ وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ سونا چاندی تو مٹی ہے۔ اصل خزانہ وہ ہے جو میں نے سب سے گہری جگہ چھپایا ہے۔ وہاں جہاں صرف صاف دل پہنچ سکتا ہے۔

اور ایک بات اور۔ تم اکیلے نہیں ہو جو اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میری موت کے بعد جنہوں نے میری حویلی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، ان کی نسل آج بھی یہیں ہے۔ وہ لالچ میں آتے ہیں۔ تم... تم کس لیے آتے ہو؟ اپنے دل سے پوچھو۔ اگر جواب ’دولت‘ ہے تو واپس چلے جاؤ۔ اگر جواب کچھ اور ہے تو تیسرا دروازہ ڈھونڈو۔ وہاں جہاں سب سے اونچی جگہ ہے، وہاں جہاں آسمان قریب ہے۔“

خاموشی۔

”چھت،“ عربیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”تیسرا دروازہ چھت پر ہے۔ خاکے میں بھی وہی نشان تھا۔“

”مگر اصل غزانہ کیا ہے؟“ عثمان نے پوچھا۔ ”سونا نہیں تو کیا؟“

حمزہ نے خط کو دوبارہ پڑھا۔ ”وہ ہے جو میں نے سب سے گہری جگہ چھپایا ہے۔“
— مگر ہم تہہ خانے میں ہیں، یہ تو سب سے گہری جگہ ہے۔ اور یہاں کچھ نہیں۔
تو...“

”تو گہری جگہ کا مطلب گہرائی نہیں،“ عربیہ نے کہا، اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”بلکہ... دل کی گہرائی! وہاں جہاں صرف صاف دل پہنچ سکتا ہے۔“ یہ کوئی جسمانی جگہ نہیں، یہ... یہ کوئی راز ہے! کوئی سچ!“

اسی لمحے اوپر سے ایک آواز آئی۔ پتھر سرکنے کی آواز۔

تینوں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ سیڑھیوں کے دہانے پر... فہد کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں عربیہ کی نوٹ بک تھی۔

”شکریہ، دوستو،“ فہد نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہاری نوٹ بک سے مجھے سب پتا چل گیا۔ سائے والی پہیلی، تہہ خانہ... سب۔ اور اب...“ اس نے پتھر کو واپس اپنی جگہ دھکیل دیا۔

دھڑام!

اندھیرا۔ مکمل اندھیرا۔

“فہد! دروازہ کھولو!” حمزہ چلایا۔

اوپر سے فہد کی ہنسی آئی۔ مدھم، پتھر کے پار سے۔ “جب ہم خزانہ نکال لیں گے تو کھول دیں گے! ویسے... بلڈر ملک کے آدمی کل صبح یہاں آرہے ہیں۔ حویلی گرانے کے لیے۔ تو تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے!”

قدموں کی آہٹ دور ہوتی گئی۔ خاموشی۔

تینوں تہہ خانے میں قید تھے۔ ٹارچ کی روشنی مدھم پڑ رہی تھی۔ بیٹری ختم ہونے والی تھی۔ ہوا بھاری ہو رہی تھی۔

“اب... اب کیا کریں گے؟” عثمان کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کی سانسیں تیز چل رہی تھیں۔ گھبراہٹ کا دورہ پڑنے والا تھا۔

“عثمان! میری طرف دیکھو!” حمزہ نے اس کے کندھے پکڑ لیے۔ “سانس لو۔ آہستہ۔ میرے ساتھ۔ اندر... باہر... اندر... باہر...”

عثمان نے اس کی پیروی کی۔ آہستہ آہستہ اس کی سانسیں معمول پر آئیں۔ “معاف کرنا،” اس نے شرمندگی سے کہا۔ “میں... مجھے بند جگہوں سے ڈر لگتا ہے۔”

”کوئی بات نہیں،“ عریبہ نے کہا۔ اس کی آواز حیرت انگیز طور پر پرسکون تھی۔
 ”ڈرنا بری بات نہیں۔ ڈر کے باوجود ہمت کرنا۔ یہی بہادری ہے۔ اور اب
 ہمیں ہمت کی ضرورت ہے۔ سوچو۔ نواب صاحب نے یہ جگہ بنائی تھی۔ کیا وہ
 واقعی کسی کو یہاں مرنے کے لیے چھوڑتے؟ ڈائری میں لکھا تھا: دوسرا دروازہ
 اس کے لیے ہے جو خوف پر قابو پائے۔‘ مطلب یہ امتحان ہے۔ خوف کا
 امتحان۔ یہاں سے نکلنے کا راستہ ضرور ہے۔“

حمزہ کے ذہن میں دادا ابو کی بات گونجی: ”امانت کا بوجھ بہت بھاری ہوتا ہے۔“
 اس نے آنکھیں بند کیں اور سوچا۔ دادا ابو نے یہ سب کیوں چھپایا؟ وہ کیوں
 ڈرے ہوئے تھے؟

”عریبہ صحیح کہہ رہی ہے،“ حمزہ نے کہا۔ ”نواب صاحب پھیلیاں بناتے تھے،
 قاتل نہیں تھے۔ یہ کمرہ بھی ایک پھیلی ہے۔ آؤ۔ ہر دیوار، ہر پتھر کو دیکھتے ہیں۔“

ٹارچ کی مدد سے روشنی میں تینوں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ عثمان
 نے دیواروں کو ٹھونکا۔ کہیں کھوکھلی آواز آئے تو۔ عریبہ نے فرش کے ہر پتھر
 کو دیکھا۔ حمزہ نے صندوق کو دوبارہ دیکھا۔ خالی صندوق۔ مگر کیوں؟ نواب
 صاحب خالی صندوق کیوں رکھتے؟

پھر اسے خیال آیا۔ اس نے صندوق کو غور سے دیکھا۔ اس کی لکڑی... اس کے جوڑے... یہ صندوق باہر سے چھوٹا لگتا تھا، مگر اندر سے... اس نے ہاتھ اندر ڈال کر تہہ کو ٹھونکا۔ کھوکھلی آواز!

”اس میں دوہری تہہ ہے!“ حمزہ نے کہا۔ اس نے ناخن سے تہہ کو کریدا۔ ایک پتلا سا تختہ ہلا اور نیچے سے... ایک چھوٹی سی چابی نکلی! پیتل کی چابی۔ بالکل ویسی جیسی دادا ابو کے صندوق میں تھی!

”دوسری چابی!“ عربیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”پہلی چابی سے ہم نے پہلا دروازہ کھولا تھا۔ نقشے کے ٹکڑے والا۔ یہ دوسری چابی... یہ کس دروازے کی ہے؟“

حمزہ نے چابی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پر باریک حروف میں لکھا تھا: ”چھت۔“

”چھت کے دروازے کی چابی!“ حمزہ نے کہا۔ ”تیسرا دروازہ! نواب صاحب نے اسے یہاں چھپایا تھا۔ تاکہ جو یہاں تک پہنچے وہی آگے بڑھ سکے!“

مگر خوشی ایک لمحے کی تھی۔ وہ اب بھی قید تھے۔ چابی تب کام آئے گی جب وہ یہاں سے نکلیں گے۔

”اب... اب کیا کریں گے؟“ عثمان کی آواز لرز رہی تھی۔

حمزہ نے دیوار کو ٹٹولا۔ ٹھوس پتھر۔ کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عربیہ نے ٹارچ کی مدھم روشنی میں کمرے کو دوبارہ دیکھا۔ اس کی نظریں صندوق پر رکیں۔

”رکو...“ اس نے کہا۔ ”صندوق... اس کے نیچے دیکھو۔“

حمزہ نے صندوق کو ایک طرف کھسکایا۔ اس کے نیچے فرش پر... ایک اور تختی تھی۔ چھوٹی سی۔ اس پر لکھا تھا:

”جو قید ہو کر بھی امید نہ چھوڑے، اس کے لیے ہر دیوار میں ایک دروازہ ہے۔“

عربیہ نے تختی کو دھکا دیا۔ وہ اندر دھنس گئی۔ اور دیوار میں ایک دراڑ نمودار ہوئی۔

مگر اسی لمحے ٹارچ بجھ گئی۔

مکمل اندھیرا۔ اور دراڑ کے پار سے... ایک عجیب سی آواز آرہی تھی۔ جیسے کوئی... سانس لے رہا ہو۔

کوئی۔ یا کچھ۔ دیوار کے اس پار تھا۔

”یہ... یہ کیا تھا؟“ عثمان کی آواز بمشکل سنائی دی۔

”شاید ہوا ہے،“ عربیہ نے کہا، مگر وہ خود بھی یقین نہیں کر رہی تھی۔ ”پرانی عمارتوں میں ہوا ایسی آوازیں نکالتی ہے۔“

”یا شاید...“ حمزہ نے کہا۔ ”شاید نواب صاحب کے پہرے دار‘۔ ڈائری میں لکھا تھا۔‘ میری حویلی میں صرف پھیلیاں نہیں، پہرے دار بھی ہیں۔“

تینوں نے ایک دوسرے کو اندھیرے میں محسوس کیا۔ دیکھ نہیں سکتے تھے، مگر ان کی سانسیں ایک دوسرے کو سنارہی تھیں۔

”ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا،“ عربیہ نے آخر کار کہا۔ ”دراڑ کے پار... شاید باہر نکلنے کا راستہ ہے۔ یا شاید... کچھ اور۔“

”میرے پاس چابی ہے،“ حمزہ نے کہا، مٹھی میں پیتل کی چابی بھینختے ہوئے۔ ”چھت کے دروازے کی۔ اگر ہم یہاں سے نکلے تو ہم تیسرا دروازہ کھول سکتے ہیں۔ مگر پہلے... پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ دراڑ کے پار کیا ہے۔“

اس نے ہاتھ بڑھایا اور دراڑ کو چھوا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ اور ہوا کے ساتھ... ایک بو۔ پرانی کاغذوں کی بو۔ جیسی دادا ابو کے صندوق سے آئی تھی۔

”یہاں... یہاں کاغذ ہیں،“ حمزہ نے سرگوشی کی۔ ”کتابیں، شاید۔“

”تو... ہم اندر جائیں؟“ عثمان نے پوچھا۔

حمزہ نے گہری سانس لی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چابی تھی، دوسرے میں عریبہ کا ہاتھ۔ ”ایک... دو... تین۔“

اس نے دراڑ کو دھکا دیا۔

دراڑ کے پار روشنی تھی۔

حمزہ نے آنکھیں جھپکائیں — اندھیرے کے بعد اچانک روشنی نے اسے چندھیا دیا۔ پھر آہستہ آہستہ منظر واضح ہوا، اور تینوں کی سانسیں رک گئیں۔

یہ ایک کمرہ تھا — مگر کوئی عام کمرہ نہیں۔ دیواروں پر فرش سے چھت تک الماریاں تھیں، اور ان میں... کتابیں۔ سینکڑوں کتابیں۔ پرانی، چمڑے کی جلد والی کتابیں، جن پر سونے کے حروف کندہ تھے۔ کچھ کتابیں فارسی میں تھیں، کچھ عربی میں، کچھ اردو میں۔ ایک الماری پر تختی لگی تھی: ”نایاب مخطوطات — ہاتھ نہ لگائیں۔“

عربیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”یہ... یہ تو خزانہ ہے! اصلی خزانہ! یہ مخطوطات... ان میں سے ہر ایک لاکھوں کا ہوگا۔ مگر ان کی اصل قیمت... ان کی اصل قیمت علم ہے!“

”نواب صاحب کتابوں کے شیدائی تھے،“ دادا ابو نے کہا۔ ”کہتے تھے — سونا خرچ ہو جاتا ہے، علم بڑھتا ہے۔“ یہ لائبریری ان کی سب سے قیمتی ملکیت تھی۔ اور یہ بھی وقف کا حصہ ہے۔ ایک عوامی لائبریری بنے گی۔“

عثمان نے ایک کتاب کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا، پھر رک گیا۔ ”میں... میں اسے چھو بھی نہیں سکتا۔ یہ تو... یہ تو تاریخ ہے۔“ پرانی، چمڑے کی جلد والی کتابیں، جن پر سونے کے حروف کندہ تھے۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک بڑی میز تھی، اس پر نقشے، خطوط، اور ایک روشن لالٹین۔ اور میز کے چپھے.. ایک کرسی۔ اور کرسی پر... ایک بوڑھا شخص۔

وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”دادا ابو؟!“ حمزہ کی چیخ نکل گئی۔

ہاں۔ وہ دادا ابو تھے! مگر یہ وہ کمزور، چارپائی پر لیٹے دادا ابو نہیں تھے۔ یہ ایک مختلف شخص لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، ان کی کمر سیدھی تھی، اور ان کے ہاتھ میں ایک لالٹین تھی۔

”تم... تم یہاں کیسے؟“ حمزہ نے ہکا کر پوچھا۔ ”تم تو گھر پر تھے! سو رہے تھے!“

دادا ابو ہنس پڑے۔ ایک گہری، گرم ہنسی۔ ”سو رہا تھا؟ بیٹا، میں تو تمہارے چپھے چپھے یہاں آیا ہوں۔ جب تم صبح گھر سے نکلے تو میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ تم کہاں جا رہے ہو۔“

”مگر... آپ کی ٹانگیں... آپ تو چل بھی نہیں سکتے!“

”چل سکتا ہوں، بیٹا۔ بس... آہستہ چلتا ہوں۔“ دادا ابو کرسی سے اٹھے۔
واقعی آہستہ، مگر مضبوط قدموں سے۔ ”اور یہ حویلی... اس کا ہر کونہ مجھے یاد
ہے۔ میں یہاں پلا بڑھا ہوں، حمزہ۔“

”پلا بڑھے؟ مگر آپ نے کہا تھا آپ یہاں چوکیدار تھے!“

دادا ابو کی مسکراہٹ مدہم پڑ گئی۔ ان کی آنکھوں میں وہی پرانا دکھ ابھر آیا۔
”یٹھو، تینوں۔ بہت لمبی کہانی ہے۔ اور وقت کم ہے۔ بلڈر ملک کے آدمی
صبح یہاں آئیں گے۔“

تینوں میز کے گرد بیٹھ گئے۔ عثمان اب بھی حیرت سے دادا ابو کو دیکھ رہا تھا۔
عربیہ نے نوٹ بک نکال لی۔ نئی نوٹ بک، پرانی تو فہد کے پاس تھی۔

”سب سے پہلے...“ دادا ابو نے کہا۔ ”مجھے معاف کر دو، حمزہ۔ میں نے تم سے
جھوٹ بولا۔ میں یہاں چوکیدار نہیں تھا۔“

”تو... کون تھے آپ؟“

دادا ابو نے میز پر رکھے ایک ڈبے کو کھولا۔ اس میں سے انہوں نے ایک پرانی
تصویر نکالی۔ وہی تصویر جو اوپر والے ہال میں لگی تھی: نواب ذوالفقار علی
خان، اور ان کے چچے کھڑا نوجوان نوکر۔

”یہ نوجوان...“ دادا ابو نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میں نہیں ہوں۔ یہ میرے ابو ہیں۔ رحیم۔ وہ نواب صاحب کے خاص ملازم تھے۔ ان کی عمر اس وقت بائیس سال تھی۔“

”تو آپ...“

”میں اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا،“ دادا ابو نے کہا۔ ”میں دو سال بعد پیدا ہوا۔ اور...“ انہوں نے ایک اور تصویر نکالی۔ اس میں ایک خوبصورت نوجوان عورت تھی۔ شاہانہ لباس میں، مگر اس کی آنکھوں میں ایک نرم اداسی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔

”یہ میری امی ہیں۔ زینب۔ اور یہ بچہ... میں ہوں۔“

خاموشی۔ تینوں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”تمہاری امی... نواب صاحب کی...“ عربہ نے آہستہ سے کہا۔

”بیٹی تھیں،“ دادا ابو نے مکمل کیا۔ ”نواب ذوالفقار علی خان کی اکلوتی بیٹی۔ جس کے بارے میں دنیا نہیں جانتی۔ کیونکہ نواب صاحب نے اسے دنیا سے چھپا رکھا تھا۔“

”کیوں؟“ حمزہ نے پوچھا۔

”کیونکہ اس نے ایک نوکر سے محبت کی تھی۔“ دادا ابو کی آواز میں فخر تھا۔
 ”میرے ابو سے۔ نواب صاحب کے خاندان والے اس رشتے کے خلاف تھے
 — ان کے لیے یہ بدنامی تھی۔ مگر نواب صاحب... نواب صاحب مختلف تھے۔
 انہوں نے دیکھا تھا کہ ان کے رشتہ دار صرف دولت کے بھوکے ہیں۔ انہوں
 نے میری امی اور ابو کو چھپ کر نکاح کرنے کی اجازت دی۔ مگر یہ بات زیادہ
 دن چھپی نہ رہ سکی۔ نواب صاحب کے بھتیجے۔ ناصر علی۔ کو بھنک پڑ گئی۔ وہی
 ناصر علی جس کا پوتا آج بلڈر ملک کہلاتا ہے!

”کیا؟“ تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

”ہاں،“ دادا ابو نے کہا۔ ”الچ نسل در نسل چلتا ہے، بیٹا۔ ناصر علی نے شور
 مچایا کہ نواب صاحب پاگل ہو گئے ہیں، کہ انہوں نے خاندان کی ناک کٹوا دی۔
 اس نے عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ نواب صاحب کی وصیت جعلی ہے۔ مقدمہ
 سالوں چلا۔ اسی دوران نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔“

”اور آپ کی امی؟“ عریبہ نے پوچھا۔

”میری امی نے حویلی چھوڑ دی۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے لگیں۔
 اسی محلے میں۔ انہوں نے مجھے عام بچوں کی طرح پالا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم
 کون ہیں۔ ناصر علی نے حویلی پر قبضے کی کوشش کی، مگر عدالت نے حویلی سیل

کر دی۔ کیونکہ وصیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اور وصیت... ”دادا ابو مسکرائے۔
”وصیت تو وقف کے کاغذات میں تھی، جو کسی کو نہیں ملے۔“

”تو بلڈر ملک... وہ ناصر علی کا پوتا ہے؟“ حمزہ نے کہا۔ ”مطلب یہ دشمنی اسی
سال پرانی ہے!“

”اسی سال پرانی،“ دادا ابو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور آج وہی کھیل دوبارہ
کھیلا جا رہا ہے۔ مگر اس بار... اس بار سچ ہمارے پاس ہے۔“

اور جب میں پیدا ہوا تو انہوں نے مجھے اپنی گود میں اٹھایا اور کہا: ”یہ میرا وارث
ہے۔ مگر دنیا کو یہ نہیں پتا چلنا چاہیے، ورنہ یہ بچہ بھی ان گدھوں کا شکار بن
جائے گا۔“

حمزہ کا سر چکرا رہا تھا۔ ”مطلب... مطلب آپ نواب صاحب کے... نواسے
ہیں؟“

”ہاں، بیٹا۔“ دادا ابو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”اور تم... تم ان کے پڑپوتے
ہو۔“

کمرے میں سنناٹا چھا گیا۔ صرف لالٹین کی لوکی سرسراہٹ تھی۔
”مگر... مگر آپ نے یہ سب کیوں چھپایا؟“ عریبہ نے پوچھا۔

”کیونکہ نواب صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا تھا، ”دادا ابو نے کہا۔“ ان کی موت سے ایک ہفتہ پہلے۔ انہوں نے مجھے۔ ایک دو سال کے بچے کی ماں کو۔ بلایا اور کہا: ”زینب، میری دولت میرے رشتہ داروں کے ہاتھ نہ لگے۔ میں نے سب کچھ وقف کر دیا ہے۔ اس شہر کے غریبوں کے لیے۔ اسکول بنے گا، اسپتال بنے گا۔ کاغذات میں نے چھپا دیے ہیں۔ اور تم... تم اس راز کی این ہو۔ جب وقت آئے تو صحیح ہاتھوں میں سونپ دینا۔“

”میری امی نے وہ وعدہ نبھایا۔ انہوں نے ساری زندگی یہ راز سینے میں رکھا۔ اور مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے سونپا۔ میں نے بھی ساری زندگی اسے سنبھالا۔ مگر اب...“ دادا ابو نے حمزہ کی طرف دیکھا۔ ”اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اور بلڈر ملک جیسے لوگ اس حویلی کو نگلنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ راز میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔ مگر تم نے صندوق کھول لیا، بیٹا۔ اور تم نے وہی کیا جو نواب صاحب چاہتے تھے۔ تم عقل سے، ہمت سے، اور سچائی سے آگے بڑھے۔ تم نے لالچ نہیں کیا۔“

”ہم نے؟“ عثمان نے کہا۔

”ہاں۔“ دادا ابو نے تینوں کو دیکھا۔ ”تم تینوں نے ہر پہیلی کو عزت سے حل کیا۔ تم نے کچھ چوری نہیں کیا۔ تم نے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہی وہ امتحان تھا جو نواب صاحب نے رکھا تھا۔ اور تم پاس ہو گئے۔“

دادا ابو اٹھے اور ایک الماری کی طرف بڑھے۔ انہوں نے ایک خفیہ خانہ کھولا۔
اور اس میں سے ایک بڑا سا لفافہ نکالا۔ اس پر مہر لگی تھی۔ عدالت کی مہر۔

”یہ ہیں وقف کے کاغذات،“ انہوں نے کہا۔ ”نواب صاحب نے اپنی ساری جائیداد۔ یہ حویلی، زمینیں، اور...“ انہوں نے ایک اور ڈبہ نکالا۔ اسے کھولا تو تینوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

سونے کی مہریں۔ سینکڑوں سونے کی مہریں۔ ہر ایک پر نواب صاحب کی مہر۔
”یہ... یہ کتنے کی ہوں گی؟“ عثمان کی آواز لرز رہی تھی۔

”کروڑوں کی،“ دادا ابو نے کہا۔ ”مگر یہ ہماری نہیں ہیں۔ یہ وقف ہیں۔ اللہ کے نام پر۔ ان سے اسکول بنے گا، اسپتال بنے گا، غریب بچے پڑھیں گے۔ یہی نواب صاحب کا خواب تھا۔ یہی اصل خزانہ ہے۔“

حمزہ نے مہروں کو دیکھا، پھر دادا ابو کو۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس تھا۔ فخر، حیرت، اور... ذمہ داری۔

”دادا ابو... اب ہم کیا کریں گے؟ بلڈر ملک کے آدمی صبح آرہے ہیں۔“

”اسی لیے ہمیں جلدی کرنی ہے،“ دادا ابو نے کہا۔ ”یہ کاغذات عدالت میں جمع کرانے ہوں گے۔ آج ہی۔ وقف کی رجسٹری... میرے ایک دوست

وکیل ہیں۔ مگر پہلے... ”انہوں نے حمزہ کی طرف دیکھا۔ ”پہلے تمہیں تیسرا دروازہ کھولنا ہے۔“

”تیسرا دروازہ؟ چھت والا؟“

”ہاں۔ نواب صاحب نے کہا تھا۔ تیسرا دروازہ صرف وہی کھول سکتا ہے جس کا دل صاف ہو۔ اور اس کے پار... ”دادا ابو رک گئے۔“ اس کے پار نواب صاحب کا آخری خط ہے۔ تمہارے لیے۔“

”میرے لیے؟“

”تمہارے خاندان کے لیے۔ چلو۔ چھت پر۔ ایک خفیہ راستہ ہے اس کمرے سے۔“

دادا ابو نے میز کو ایک طرف کھسکایا۔ نیچے ایک اور سرنگ تھی۔ اوپر جاتی ہوئی۔ ”یہ نواب صاحب کے زمانے کی ہے۔ نوکروں کے لیے۔ چلو۔“

سرنگ تنگ تھی مگر اوپر کی طرف جاتی تھی۔ دادا ابو سب سے آگے تھے۔ ان کی رفتار حیرت انگیز تھی، جیسے انہوں نے یہ راستہ سینکڑوں بار طے کیا ہو۔ حمزہ، عربیہ اور عثمان ان کے پیچھے تھے۔

”دادا ابو، ”حمزہ نے چڑھتے ہوئے پوچھا۔“ آپ یہاں اکثر آتے تھے؟“

”ہر مہینے، ”دادا ابو نے کہا۔“ کاغذات کی حفاظت کے لیے۔ اور... اپنی امی کی یاد میں۔ یہ حویلی میرا بچپن ہے، بیٹا۔“

سرنگ میں چڑھتے ہوئے دادا ابو کی آواز میں ایک نرم لہر آگئی۔ ”یاد ہے... جب میں پانچ سال کا تھا، امی مجھے یہاں لاتی تھیں۔ چھپ کر۔ ہم چھت پر پتنگ اڑاتے تھے۔ نواب صاحب... میرے نانا... وہ مجھے کندھے پر بٹھا کر پورا شہر دکھاتے تھے۔ کہتے تھے: ’دیکھو بیٹا، یہ سب تمہارا ہے۔ مگر تمہارا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے رکھ لو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کی حفاظت کرو۔“

”کتنے اچھے انسان تھے وہ،“ عریبہ نے کہا۔

”تھے،“ دادا ابو نے کہا۔ ”مگر ان کے اپنے خاندان نے انہیں سکون سے مرنے بھی نہ دیا۔ آخری دنوں میں وہ بہت اکیلے تھے۔ بس میری امی ان کے پاس جاتی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں، چھپ کر۔“

حمزہ کے گلے میں گٹھلی سی اٹکی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے خاندان کی اتنی بڑی کہانی ہے۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ وہ ایک عام سے محلے کا عام سا لڑکا ہے۔ مگر اب... اب وہ نواب ذوالفقار علی خان کا پڑپوتا تھا۔

”دادا ابو،“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”کیونکہ میں ڈرتا تھا، بیٹا،“ دادا ابو نے رک کر کہا۔ ”میں ڈرتا تھا کہ یہ بوجھ تمہیں کچل دے گا۔ میں ڈرتا تھا کہ ناصر علی کی نسل تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ اور... میں ڈرتا تھا کہ تم لالچ میں آ جاؤ گے۔ مگر آج میں نے دیکھا۔ تم نے ہر امتحان پاس کیا۔ تم تیار ہو۔“

سرنگ ایک چھوٹے سے دروازے پر ختم ہوئی۔ دادا ابو نے اسے دھکا دیا۔ اور وہ چھت پر نکل آئے۔

شام ڈھل رہی تھی۔ آسمان نارنجی اور گلابی رنگوں میں رنگا تھا۔ چھت سے پورا شہر نظر آ رہا تھا۔ گھروں کے جھنڈ، مسجد کے مینار، دور کہیں ٹرین کی سیٹی۔ ہوا میں آزادی تھی۔

مگر تینوں کی نظریں چھت کے نیچوں بیچ رکھی ایک چھوٹی سی عمارت پر تھیں۔ گنبد والی۔ اس کے دروازے پر پیتل کا ایک بڑا ساتالا تھا۔

”تیسرا دروازہ،“ عربیہ نے سرگوشی کی۔

حمزہ نے جیب سے پیتل کی چابی نکالی۔ وہی جو تہ خانے کے صندوق سے ملی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے چابی تالے میں ڈالی۔

کٹ۔

تالا کھل گیا۔

اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں صرف ایک میز تھی، اور میز پر... ایک لکڑی کا ڈبہ۔ حمزہ نے ڈبہ کھولا۔ اندر ایک خط تھا — اور ایک لاکٹ۔ سونے کا لاکٹ۔

حمزہ نے خط اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا:

“میرے پیارے وارث،

اگر تم یہ پڑھ رہے ہو تو تم نے تینوں دروازے پار کر لیے ہیں۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تمہارا دل صاف ہے، تمہاری نیت نیک ہے۔ اب سچ سنو۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت دولت کمائی، مگر سکون نہ پایا۔ میرے رشتہ دار میری موت کا انتظار کر رہے تھے۔ دولت کے لیے۔ مگر میں نے فیصلہ کیا کہ میری دولت ان کے ہاتھ نہیں لگے گی۔ میں نے سب کچھ وقف کر دیا — غریبوں کے لیے، یتیموں کے لیے، اس شہر کے لیے جس نے مجھے سب کچھ دیا۔

یہ لاکٹ میری بیٹی زینب کا ہے۔ اس میں اس کی اور اس کے بیٹے کی تصویر ہے۔ یہ بچہ میرا نواسہ ہے۔ میرا سچا وارث۔ دنیا اسے نہیں جانتی، مگر میں جانتا ہوں۔ اور اب تم جانتے ہو۔

یاد رکھو۔ اصل خزانہ سونا نہیں، کردار ہے۔ جو امانت کی حفاظت کرے، وہی امیر ہے۔

تمہارا دادا، ذوالفقار علی خان

حمزہ نے لاکٹ کھولا۔ اندر دو تصویریں تھیں۔ ایک نوجوان عورت کی (زینب)، اور ایک بچے کی۔ بچے کی آنکھیں... حمزہ کی اپنی آنکھوں جیسی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ “دادا ابو...”

دادا ابو نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ “تم نواب صاحب کے پڑپوتے ہو، حمزہ۔ یہ حویلی، یہ خزانہ... یہ سب تمہاری امانت ہے۔ مگر یاد رکھو۔ یہ تمہاری ملکیت نہیں، تمہاری ذمہ داری ہے۔”

اسی لمحے نیچے سے شور آیا۔ گاڑیوں کی آوازیں، لوگوں کی چیخیں۔

تینوں چھت کی منڈیر پر دوڑے۔ نیچے دیکھا تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

حویلی کے باہر تین بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور ان کے ساتھ... ایک بلڈوزر! پیلا، بھاری بلڈوزر۔ اس کا بلیڈ سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس کے گرد دس بارہ آدمی تھے۔ مزدور، اور ان کے ساتھ ایک موٹا شخص سفید کپڑوں میں۔

”بلڈر ملک!“ عریبہ نے کہا۔ ”وہ وقت سے پہلے آگیا!“

”اور اس کے ساتھ...“ عثمان نے اشارہ کیا۔ ”فہد بھی ہے!“

واقعی۔ فہد اپنے ابو کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ پریشان تھا۔ وہ بار بار حویلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

”وہ ہمیں ڈھونڈ رہا ہے،“ حمزہ نے کہا۔ ”اسے پتا ہے ہم اندر ہیں۔“

بلڈر ملک نے ایک میگا فون اٹھایا۔ اس کی آواز پورے میدان میں گونجی: ”حویلی کے اندر جو بھی ہے۔ باہر نکل آؤ! یہ عمارت غیر محفوظ ہے! ہم اسے گرانے آئے ہیں! تمہارے پاس دس منٹ ہیں!“

”دس منٹ؟“ عثمان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”مگر... مگر عدالت نے روک رکھا ہے!“

”عدالت کا حکم اس کے پاس ہوگا۔ جعلی،“ دادا ابو نے کہا، ان کی آواز میں غصہ تھا۔ ”یہ لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔ پہلے گرا دو، پھر مقدمہ لڑتے رہو۔“

”اب کیا کریں؟“ عربہ نے پوچھا۔ ”کاغذات ہمارے پاس ہیں، مگر عدالت... وکیل... اس میں دن لگیں گے!“

دادا ابو نے سوچتے ہوئے کہا: ”ہمیں وقت چاہیے۔ بس آج کی رات۔ اگر ہم صبح تک حویلی کو بچالیں تو میں وکیل سے بات کر کے عدالت سے حکم امتناعی لے لوں گا۔ مگر...“

”مگر کیا؟“

”مگر ان دس منٹ میں ہمیں باہر نکلنا ہوگا۔ ورنہ وہ بلڈوزر چلا دیں گے۔ ہمارے اندر ہوتے ہوئے بھی۔“

خاموشی۔ تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

پھر حمزہ نے لاکٹ اپنی جیب میں رکھا، خط کو احتیاط سے تہہ کیا، اور کہا: ”تو ہم باہر نکلتے ہیں۔ مگر خالی ہاتھ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ عثمان نے پوچھا۔

حمزہ کی آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی۔ وہی چمک جو اس کے پڑدادا کی تصویروں میں تھی۔ ”ہم ان کا سامنا کریں گے۔ کاغذات ہمارے پاس ہیں۔ سچ ہمارے پاس ہے۔ اور...“ اس نے چھت کی منڈیر سے نیچے دیکھا، جہاں ہند کھڑا تھا۔ ”اور شاید... ایک دوست بھی۔“

وہ سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ دادا ابو، حمزہ، عربیہ، عثمان۔ ہر قدم کے ساتھ ان کے دل زور سے دھڑک رہے تھے۔ مرکزی دروازے پر پہنچ کر حمزہ نے زنجیریں کھولیں۔ وہی زنجیریں جو اسی سال سے بند تھیں۔

دروازہ کھلا۔

باہر بلڈر ملک اپنے آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے چھ بلڈوزر کا انجن گرج رہا تھا۔ محلے کے کچھ لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ تماشائی۔

”باہر نکل آؤ!“ بلڈر ملک نے میگا فون میں کہا۔ پھر اس کی نظر دادا ابو پر پڑی۔

”اور یہ بوڑھا کون ہے؟“

دادا ابو آگے بڑھے۔ ان کی کمر سیدھی تھی، ان کی آواز مضبوط۔ ”میں اس حویلی کا امین ہوں۔ اور تم... تم یہاں غیر قانونی آئے ہو۔“

بلڈر ملک ہنس پڑا۔ ایک بھاری، نفرت انگیز ہنسی۔ ”امین؟ بوڑھے میاں، یہ حویلی اب میری ہے۔ عدالت کا حکم میرے پاس ہے۔“ اس نے ایک کاغذ لہرایا۔

”جھوٹ!“ حمزہ نے کہا۔ وہ آگے بڑھا۔ سولہ سال کا لڑکا، مگر اس کی آنکھوں میں شیر کی ہمت تھی۔ ”آپ کے پاس کوئی اصلی حکم نہیں ہے۔ اور یہ حویلی آپ کی نہیں ہے۔ یہ وقف ہے!“

اس نے وقف کے کاغذات اونچے کیے۔ ”یہ ہیں نواب ذوالفقار علی خان کے وقف کے کاغذات — عدالت کی مہر کے ساتھ! یہ حویلی اور ساری جائیداد غریبوں کے لیے وقف ہے! آپ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے!“

مجمع میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ بلڈر ملک کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”جعلی ہیں! یہ سب جعلی ہے! بلڈوزر چلاؤ!“

”رکو!“

ایک آواز آئی — فہد کی۔ وہ اپنے ابو کے پاس سے نکل کر آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا موبائل تھا۔ اس کا چہرہ میلا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں فیصلہ تھا۔

”ابو... مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے کہا۔ ”مگر یہ غلط ہے۔ اور میں اس میں حصہ نہیں بنوں گا۔“

”فہد! تم کیا کر رہے ہو؟“ اس کے ابو چلائے۔

فہد نے موبائل اونچا کیا اور ایک بٹن دبایا۔ اسپیکر سے ایک آواز آئی — بلڈر ملک کی آواز:

”جعلی آرڈر بنواؤ۔ حویلی گرانی ہے، چاہے اندر کوئی ہو یا نہ ہو۔ پیسے کی فکر مت کرو۔“

سنائا۔ پھر مجمع میں شور اٹھا۔ کسی نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ دور سے سائرن کی آواز آنے لگی۔

بلڈر ملک کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”یہ... یہ سازش ہے! میں... میں واپس آؤں گا! یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی!“ وہ اپنی گاڑی کی طرف بھاگا۔ اس کے آدمی بھی بکھر گئے۔ بلڈوزر کا انجن بند ہو گیا۔

فہد کے ابو وہیں کھڑے رہے۔ شکست خوردہ۔ فہد ان کے پاس گیا۔ ”ابو... ہمیں صحیح راستہ اپنانا ہوگا۔“

حمزہ فہد کے پاس گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”شکریہ، فہد۔“
فہد نے مسکرا کر کہا: ”دوست؟“

”دوست،“ حمزہ نے کہا۔

عربیہ نے اپنی نوٹ بک واپس لی۔ فہد نے اسے جیب سے نکال کر دیا۔
”معاف کرنا،“ اس نے کہا۔ ”تمہاری پھیلیاں... واقعی کمال کی تھیں۔“

عثمان نے سونے کی مہروں والا ڈبہ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پولیس آگئی۔ انسپکٹر نے کاغذات دیکھے، مہر کی تصدیق کی، اور بلڈر ملک کے خلاف رپورٹ لکھی۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں،“ انسپکٹر نے دادا ابو سے کہا۔ ”وقف کے

کاغذات اصلی لگتے ہیں۔ جب تک عدالت فیصلہ نہ کرے، حویلی کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ میں خود یہاں پہرہ لگواؤں گا۔

محلے کے لوگ اب کھل کر باتیں کر رہے تھے۔ ایک بوڑھی خاتون آگے بڑھیں۔ وہی جو گلی کے نکر پر رہتی تھیں۔ ”میں نے سنا تھا...“ انہوں نے کہا۔ ”میری ساس کہتی تھیں کہ نواب صاحب غریبوں کے ہمدرد تھے۔ آج... آج یقین آگیا۔“

ایک نوجوان نے نعرہ لگایا: ”نواب صاحب زندہ باد!“ اور مجمع نے ساتھ دیا۔ حمزہ نے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں عزت تھی۔ اس کے پڑدادا کی عزت۔ اس کے خاندان کی عزت۔

فہد حمزہ کے پاس آیا۔ ”تمہارے دادا ابو... وہ ٹھیک ہو جائیں گے نا؟“

”ہاں،“ حمزہ نے کہا۔ ”ڈاکٹر نے کہا ہے خطرے سے باہر ہیں۔“

”اچھا۔“ فہد نے زمین کی طرف دیکھا۔ ”حمزہ... میں نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ معاف کر دو۔“

”تم نے آخر میں صحیح فیصلہ کیا،“ حمزہ نے کہا۔ ”یہی اہم ہے۔“

پولیس آگئی۔ انسپکٹر نے کاغذات دیکھے، بلڈر ملک کے خلاف رپورٹ لکھی۔ محلے کے لوگ حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ یا... ایسا لگتا تھا۔
مگر پھر۔ دادا ابو لڑکھڑائے۔

”دادا ابو! حمزہ نے انہیں سنبھالا۔ دادا ابو کا چہرہ میلا پڑ گیا تھا۔ ان کی سانسیں تیز
چل رہی تھیں۔“ ایمبو لینس! کوئی ایمبو لینس بلاؤ!“

افرا تفری میں کسی نے ایمبو لینس کو فون کیا۔ دادا ابو کو زمین پر لٹایا گیا۔ حمزہ ان
کے پاس بیٹھا ان کا ہاتھ پکڑے تھا۔

”دادا ابو... آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بس تھوڑی دیر۔“

دادا ابو نے آنکھیں کھولیں۔ ان کی آواز بہت مدہم تھی۔ ”حمزہ... بیٹا... میری
بات سنو...“

”جی دادا ابو۔“

”نقشے کا... تیسرا ٹکڑا...“ دادا ابو نے کہا۔ ”وہ اب بھی... کہیں ہے۔ میں نے
اسے... چھپایا تھا۔ مگر... مگر میں بھول گیا ہوں کہاں۔“

”کوئی بات نہیں دادا ابو، ہم ڈھونڈ لیں گے۔“

”نہیں... سنو...“ دادا ابو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا۔ ”وقف کے کاغذات میں... لکھا ہے... چار دروازے۔ چار! ہم نے صرف تین کھولے ہیں۔ چوتھا دروازہ... وہ اب بھی بند ہے۔ اور اس کے پار...“

”اس کے پار کیا ہے، دادا ابو؟“

دادا ابو کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آتی — خوف اور امید کا امتزاج۔
”اس کے پار... اصل خزانہ ہے، بیٹا۔ جو ابھی تک... نہیں ملا۔“

ایمبولینس کا سائرن قریب آگیا۔ لوگ دادا ابو کو اٹھانے لگے۔

”دادا ابو! چوتھا دروازہ کہاں ہے؟“ حمزہ نے چل کر پوچھا۔

دادا ابو نے آخری الفاظ کہے — اتنے مدہم کہ صرف حمزہ سن سکا:

”جہاں... جہاں سب کچھ شروع ہوا تھا...“

پھر وہ بے ہوش ہو گئے۔

اس رات حمزہ اسپتال کے باہر بیچ پر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا دادا ابو خطرے سے باہر ہیں — بس تھکن اور صدمہ تھا۔ مگر حمزہ کا ذہن کہیں اور تھا۔

”چار دروازے،“ اس نے سرگوشی کی۔ ”تیسرا ٹکڑا غائب۔ چوتھا دروازہ بند۔ اصل خزانہ ابھی نہیں ملا۔“

عربیہ اس کے پاس آکر بیٹھی۔ ”تم کیا سوچ رہے ہو؟“

”یہ کہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی،“ حمزہ نے کہا۔ اس نے جیب سے لاکٹ نکالا اور اسے دیکھا۔ ”نواب صاحب نے تین دروازے بنائے تھے۔ یا چار؟ دادا ابو نے کہا چار۔ تو چوتھا کہاں ہے؟ اور نقشے کا تیسرا ٹکڑا... دادا ابو نے اسے کہاں چھپایا؟“

”اور جہاں سب کچھ شروع ہوا تھا، کا کیا مطلب ہے؟“ عثمان نے کہا، جو دوسری طرف بیٹھا تھا۔

تینوں خاموش ہو گئے۔ پھر عربیہ نے آہستہ سے کہا: ”سب کچھ... صندوق سے شروع ہوا تھا۔ دادا ابو کے صندوق سے۔“

حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہارا مطلب... تیسرا ٹکڑا صندوق میں ہے؟ مگر ہم نے صندوق دیکھا تھا۔ اس میں صرف دو چیزیں تھیں...“

”یا شاید...“ عربیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”شاید صندوق میں کوئی خفیہ خانہ ہو۔ جیسے تہ خانے کے صندوق میں دوہری تہ تھی!“

حمزہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کل صبح۔ ہم صندوق کو دوبارہ دیکھیں گے۔“

”اور چوتھا دروازہ؟“ عثمان نے پوچھا۔

حمزہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے نکل آئے تھے۔ اس نے لاکٹ کو
مٹھی میں بھینچا۔

”ہم اسے بھی ڈھونڈیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ یہ اب صرف خزانے کی
بات نہیں رہی۔ یہ میرے خاندان کی بات ہے۔ یہ... یہ میری ذمہ داری
ہے۔“

دور کہیں، حویلی کی میناروں پر چاندنی پڑ رہی تھی۔ اور ان میناروں کے سائے
میں... کوئی کھڑا تھا۔ ایک سایہ۔ جو تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ
چمک رہا تھا۔ جیسے... کاغذ کا ایک ٹکڑا۔

نقشے کا تیسرا ٹکڑا۔

مگر وہ کون تھا؟ اور اسے ٹکڑا کہاں سے ملا؟
یہ سوالات... اگلی قسط میں۔

دادا ابو کی طبیعت سنبھل رہی تھی، مگر ان کی آنکھوں میں بے چینی اب بھی ویسی ہی تھی جیسی اس رات تھی جب وہ تہہ خانے کے اندھیرے میں نمودار ہوئے تھے۔ ہسپتال کے چھوٹے سے کمرے میں حمزہ، اریبہ، عثمان اور فہد ان کے بستر کے گرد کھڑے تھے۔ کھڑکی سے شام کی سنہری روشنی اندر آرہی تھی۔

"تیسرا نقشہ..." دادا ابو نے کمزور آواز میں کہا، "میناروں پر جو سایہ تھا... وہ نقشہ کسی غلط ہاتھ میں نہیں جانا چاہیے۔ میرے دادا — نواب صاحب — نے اسے امانت سمجھ کر سونپا تھا۔"

حمزہ نے نواب صاحب کی پرانی ڈائری کھولی۔ آخری صفحے پر کانپتے ہاتھوں سے لکھا ایک شعر تھا:

"تین دروازے کھل چکے، چوتھا ہے پنہاں ڈوبتے سورج کے سائے میں، چھپا ہے نشاں مینار کی چھاؤں جس پتھر پر رک جائے سمجھو وہیں دفن ہے، راز کا خزانہ"

اریبہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "سمجھ گئی! سورج ڈوبتے وقت مینار کا سایہ جس پتھر پر پڑے گا۔ وہیں چوتھے دروازے کا سراغ ہوگا! نواب صاحب نے سائے کو نشانی بنایا تھا۔"

"مگر مینار پر تو وہ سایہ نما شخص تھا،" عثمان نے آہستہ سے کہا۔ "تیسرے نقشے والا۔ اگر اس نے ہمیں دیکھ لیا تو؟"

فہد نے کندھے اچکائے۔ "وہ جو بھی ہے، اسے نقشہ ہمیں دینا ہوگا۔ ورنہ..."

"ورنہ کیا؟" حمزہ نے پوچھا۔ "ملک صاحب تو پولیس کی حراست میں ہیں۔ تمہاری ریکارڈنگ کام کر گئی، فہد۔ تم نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔"

فہد مسکرایا، مگر اس کی مسکراہٹ میں ایک اداسی تھی جو حمزہ نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ "کاش سب کچھ اتنا آسان ہوتا، حمزہ۔"

دادا ابو نے حمزہ کا ہاتھ تھاما۔ "جلدی واپس آنا۔ اور بیٹا... جو بھی ہو، ڈرنا مت۔ نواب صاحب کا خون تمہاری رگوں میں ہے۔ اور ان کا سب سے بڑا خزانہ ان کی ہمت تھی، سونا نہیں۔"

شام کو سورج ڈوبنے سے ایک گھنٹہ پہلے، چاروں پرانی حویلی پہنچے۔ صحن میں وہی پرانا کنواں تھا جس کا پانی برسوں پہلے سوکھ چکا تھا، اور اس کے پاس دو اونچے

مینار کھڑے تھے۔ نواب صاحب نے اپنی حویلی کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنوائی تھی، جواب ویران تھی۔

"مینار پر چڑھنا ہوگا،" اریبہ نے کہا۔ "سایہ وہیں سے دیکھنا ہوگا۔"

تنگ اور اندھیری سیڑھیاں چڑھتے ہوئے حمزہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ہر قدم پر پرانے پتھر چرچراتے تھے۔ اوپر پہنچ کر جو منظر انہوں نے دیکھا، اس سے ان کی سانس رک گئی۔ ایک لڑکی، بالکل ان ہی کی عمر کی، مینار کی منڈیر سے ٹیک لگائے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک پرانا ٹکڑا تھا۔

"تم... تم ہو وہ سایہ؟" حمزہ نے حیرت سے پوچھا۔

لڑکی آہستہ سے مڑی۔ اس کی آنکھوں میں چوکسی تھی، ڈر نہیں۔ "میرا نام زارا ہے۔ اور یہ نقشہ تمہیں اتنی آسانی سے نہیں ملے گا۔"

"ہم چور نہیں ہیں!" عثمان نے جلدی سے کہا، ہاتھ اٹھا کر۔

"ہر چور یہی کہتا ہے،" زارا نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ پھر اس نے حمزہ کی طرف غور سے دیکھا۔ "تم نواب صاحب کے پڑپوتے ہو، ہے نا؟ تمہارے دادا ابو نے تمہیں سب بتا دیا ہوگا... تو سنو، میرے دادا، رحیم خان، نواب صاحب کے سب سے وفادار ملازم تھے۔ مرتے وقت نواب صاحب نے انہیں یہ نقشہ

سو نپا تھا۔ امانت کے طور پر، حفاظت کے لیے۔ میرا خاندان تین نسلوں سے اس کی حفاظت کر رہا ہے۔"

حمزہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "دادا ابو نے بتایا تھا کہ وقف کی دستاویز میں چار دروازوں کا ذکر ہے۔ یہ خزانہ کسی ایک کا نہیں۔ یہ غریبوں کے اسکول اور ہسپتال کے لیے وقف ہے۔"

زارا نے اسے دیر تک دیکھا، جیسے اس کے دل کی سچائی پر کھ رہی ہو۔ پھر بولی: "ایک شرط پر دوں گی۔ میرے دادا کہتے تھے۔ جو عقل سے کام نہ لے، وہ خزانے کا حقدار نہیں۔ یہ پہیلی بجھاؤ۔"

اس نے کپڑے کے ٹکڑے کے پھلے حصے پر لکھی پہیلی پڑھی:

"میرے پاس شہر ہیں، مگر گھر نہیں، میرے پاس پہاڑ ہیں، مگر درخت نہیں، میرے پاس سمندر ہے، مگر پانی نہیں، بتاؤ میں کیا ہوں؟"

عثمان نے سر کھجایا۔ فہد گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اریبہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"نقشہ!" اریبہ نے فوراً کہا۔ "جواب ہے۔ نقشہ!"

زارا کی آنکھوں میں پہلی بار گرمجوشی کی چمک آئی۔ "بالکل صحیح۔" اس نے کپڑے کا ٹکڑا حمزہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ "سنبھال کر رکھنا۔ اور... شکریہ کہ تم نے پہیلی کا جواب عقل سے دیا، طاقت سے نہیں۔ میرے دادا خوش ہوتے۔"

اب تینوں ٹکڑے ان کے پاس تھے۔ اریبہ نے کانپتے ہاتھوں سے انہیں جوڑا۔ اور جیسے ہی تیسرا ٹکڑا اپنی جگہ بیٹھا، نقشے پر ایک نئی جگہ سیاہی کی طرح ابھرنے لگی: صحن کے پرانے کنویں کے عین نیچے ایک نشان۔

"چوتھا دروازہ کنویں کے اندر ہے!" حمزہ کی آواز جوش سے کانپ رہی تھی۔

وہ تیزی سے نیچے اترے۔ کنویں میں لوہے کی زنگ آلود سیڑھی لگی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ نیچے اترے۔ اندھیرا گہرا ہوتا گیا، ہوا میں سیلن اور مٹی کی بو تھی، اور دیواروں پر سبز کائی چمک رہی تھی۔

نیچے ایک بھاری پتھر کا دروازہ تھا۔ اس پر چار خانے بنے تھے۔ تین میں نقشے کے تینوں ٹکڑوں کے نشان کندہ تھے، اور چوتھا خانہ خالی تھا۔

"چوتھا نشان کہاں سے لائیں؟" عثمان نے پریشانی سے پوچھا۔

اریبہ نے اپنی جیب سے نواب صاحب کی ڈائری نکالی اور اس کا وہ صفحہ کھولا جس پر نواب صاحب کی مہر لگی تھی۔ "یہ دیکھو! ڈائری کی مہر۔ اس کا ڈیزائن بالکل خالی خانے جیسا ہے!"

حمزہ نے کانپتے ہاتھوں سے مہر کو خالی خانے پر رکھا۔ ایک گہری "کک" کی آواز آئی۔ اور بھاری پتھر کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اور وہ... بالکل خالی تھا۔

صرف دھول، ایک خالی صندوق، اور فرش پر تازہ قدموں کے نشان جو ایک دیوار کی طرف جا کر غائب ہو جاتے تھے۔

"کوئی ہم سے پہلے یہاں آچکا ہے،" فہد کی آواز کانپ رہی تھی۔

حمزہ کی نظر فرش پر پڑی ایک چھوٹی سی چیز پر پڑی۔ ایک کوٹ کا بٹن۔ اس نے جھک کر اٹھایا اور غور سے دیکھا... اور اس کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

یہ بٹن وہ پہچانتا تھا۔ یہ فہد کی جیکٹ کا بٹن تھا۔ وہی جیکٹ جو فہد آج پہنے ہوئے تھا، جس کا ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔

"فہد..." حمزہ نے آہستہ سے کہا، بٹن اس کی طرف بڑھاتے ہوئے، "یہ تمہاری جیکٹ کا بٹن یہاں کیا کر رہا ہے؟"

فہد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ "میں... میں قسم کھاتا ہوں، حمزہ! میں یہاں کبھی نہیں آیا! یہ... یہ ناممکن ہے!"

اور اسی لمحے، کنوئیں کے اوپر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی
سیڑھی سے نیچے آ رہا تھا۔

کنویں کی سیڑھیوں سے اترتی چاپ ہر لمحے قریب آرہی تھی۔
ٹھک... ٹھک... ٹھک...

حم za نے ٹارچ کا رخ سیڑھیوں کی طرف موڑ دیا۔ عثمان نے خاموشی سے
زمین سے ایک ڈھیلی اینٹ اٹھالی۔ عریبہ نے زارا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔
سیڑھیوں کے موڑ سے پہلے ایک سایہ نمودار ہوا۔ پھر ایک آدمی۔ مٹی سے اٹے
کپڑے، ہاتھ میں ٹارچ، اور... حم za کی سانس رک گئی۔
"یہ... یہ تو فہد کی جیکٹ ہے!"

وہ بھوری جیکٹ، جس کے کالر پر وہی ٹانکے تھے جو فہد کی امی نے لگائے تھے
— حم za نے اسے درجنوں بار دیکھا تھا۔ آدمی چونکا، ٹارچ کی روشنی سیدھی
ان کے چہروں پر پڑی۔

"رکو!" عثمان اینٹ اٹھانے آگے بڑھا۔ "تم کون ہو؟"

آدمی نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "ارے ارے! میں ہوں... عمران! فہد کا کزن!"

"عمران بھائی؟" حم za حیران رہ گیا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور فہد کی جیکٹ تمہارے پاس کیسے؟"

عمران نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی اور ڈر دونوں تھے۔
"سنو... پہلے ٹارچ ہٹاؤ آنکھوں سے۔ میں چور نہیں ہوں۔ ملک صاحب نے بھیجا تھا مجھے۔"

"بلڈر ملک؟" زار کی آواز کانپ گئی۔

"ہاں۔" عمران دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "میں ان کی سائٹ پر ہیلپر ہوں۔ انہوں نے تم لوگوں کو آج شام حویلی کے گرد گھومتے دیکھا تھا۔ کہا۔ جاؤ، دیکھو یہ بچے کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔ جو ملے، مجھے خبر دو، پیسے ملیں گے۔"

"تو تم پہلے بھی یہاں آئے تھے؟" عربیہ کی نظریں اس کے قدموں کے نشانوں پر تھیں۔ "یہ تازہ قدموں کے نشان... تمہارے ہیں؟"

"ہاں۔" عمران نے سر جھکا لیا۔ "ایک گھنٹہ پہلے آیا تھا۔ خالی صندوق دیکھا، کچھ نہ ملا، واپس چلا گیا۔ پھر ملک صاحب کا فون آیا۔ 'کچھ ملا؟' میں نے کہا نہیں۔ انہوں نے کہا پھر سے جا کر دیکھو، شاید کچھ چھوٹ جائے۔ تو... میں واپس آیا۔"

حم za کی مٹھیاں بھیج گئیں۔ "اور فہد کی جیکٹ؟ وہ بٹن جو ہمیں ملا۔ وہ تم نے گرایا؟"

"سنو، یہی تو بات ہے!" عمران جلدی سے بولا۔ "فہد نے جھوٹ نہیں بولا۔ وہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ اس کی جیکٹ چائے کے کھوکھے پر ٹنگی تھی۔ تم لوگوں کو یاد ہے نا، وہ کھوکھا جہاں تم سب بیٹھتے ہو؟ میری اپنی قمیض حویلی کے ٹوٹے گیٹ میں پھنس کر پھٹ گئی تھی۔ سردی لگ رہی تھی، تو میں نے فہد کی جیکٹ اٹھالی۔ سوچا واپس رکھ دوں گا۔ سیڑھیوں کے زنگ آود قبضے میں جیکٹ پھنسی، ایک بٹن ٹوٹ کر گر گیا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔"

خاموشی چھا گئی۔ حم za نے جیب سے وہ بٹن نکالا۔ پیتل کا، کنارے پر وہی ڈیزائن جو فہد کی جیکٹ کے بٹنوں پر تھا۔

"مطلب..." عثمان نے اینٹ نیچے رکھ دی۔ "فہد سچ کہہ رہا تھا۔ اس کی جیکٹ یہاں آئی تھی، وہ خود نہیں۔"

عربیہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "یہی تو پہیلی تھی۔ ہم ثبوت دیکھ رہے تھے، کہانی نہیں۔ بٹن سچ بول رہا تھا۔ بس ہم غلط سوال پوچھ رہے تھے۔ سوال یہ نہیں تھا کہ فہد یہاں آیا یا نہیں۔ سوال یہ تھا کہ اس کی جیکٹ یہاں کیسے آئی۔"

عمران نے حیرت سے عربیہ کو دیکھا۔ "تم تو واقعی پہیلیاں سلجھاتی ہو۔"

"ابھی ایک اور پہیلی باقی ہے۔" عربیہ ٹارچ لے کر دیوار کی طرف بڑھی جہاں قدموں کے نشان ختم ہو رہے تھے۔ "تمہارے قدم یہاں آکر رک گئے۔ لیکن تم تو خالی صندوق کے پاس سے واپس گئے تھے۔ پھر نشان دیوار تک کیوں آئے؟"

عمران نے کندھے اچکائے۔ "میں نے دیوار کو دھکیلا تھا۔ سوچا شاید تجھے کچھ ہو۔ کچھ نہیں ہلا۔"

عربیہ دیوار کے پتھروں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی انگلیاں ایک جگہ رک گئیں۔ "دیکھو!"

ٹارچ کی روشنی میں دیوار پر چار چھوٹی نقش و نگار والی تصویریں نظر آئیں۔ چار دروازے، ایک قطار میں۔ بالکل ویسے ہی جیسے جرے ہوئے نقشے کے تین ٹکڑوں پر بنے تھے۔

"نقشے پر چار دروازے تھے،" عربیہ کی آواز میں وہ چمک آگئی جو ہمیشہ کسی راز کے قریب پہنچ کر آتی تھی۔ "تین ٹکڑوں میں تین دروازے صاف بنے ہیں۔ چوتھا دروازہ... دیکھو، نقشے پر وہ سب سے چھوٹا بنا ہے۔ سب نے سمجھا شاید جگہ کم تھی۔ لیکن..."

اس نے دیوار پر بنے چوتھے دروازے کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ باقی تین سے تھوڑا اندر دھنسا ہوا تھا۔

"یہ دروازہ نہیں ہے،" عربہ نے آہستہ کہا۔ "یہ کنجی ہے۔ نقشہ بنانے والے نے چوتھے دروازے کو چابی بنا دیا۔ کیونکہ اصل دروازہ تو یہ دیوار خود ہے!"

اس نے انگوٹھے سے چوتھی تصویر کو دبایا۔

پہلے کچھ نہ ہوا۔ پھر... گڑگڑاہٹ۔ دیوار کا ایک حصہ۔ کمر کی اونچائی تک۔ آہستہ آہستہ گھومنے لگا۔ پتھر پر پتھر رگڑنے کی آواز کنویں میں گونج اٹھی۔ ایک تنگ طاق نمودار ہوا۔

سب کی سانسیں رک گئیں۔

طاق میں سونا نہیں تھا۔ نہ ہیرے، نہ جواہرات۔ وہاں ایک مٹی کا مرتبان تھا، جس کے منہ پر لال لاکھ کی مہر لگی تھی۔ مہر پر اب بھی صاف پڑھا جا سکتا تھا: نواب ذوالفقار علی خان۔ مرتبان کے پاس ایک سنہری مہر اور پیتل کی ایک چھوٹی سی کنجی رکھی تھی۔

زارا کے ہاتھ کانپنے لگے۔ "یہ... یہ میرے دادا ابو کی نشانی ہے۔ رحیم خاں ہمیشہ کہتے تھے۔ اصل امانت مٹی میں چھپتی ہے، پتھر میں نہیں۔"

حم za نے احتیاط سے مہر توڑی۔ اندر ایک تہہ کیا ہوا خط تھا۔ پرانا کاغذ، لیکن سیاہی اب بھی گہری۔ عربیہ نے ٹارچ کی روشنی میں پڑھنا شروع کیا:

"میرے بیٹے کے نام... جب یہ خط تمہارے ہاتھ لگے، سمجھ لینا کہ لالچی نظریں حویلی پر پڑ چکی ہیں۔ ملک کے باپ نے پہلی بار حویلی خریدنے کی پیشکش کی تھی، اسی رات میں نے رحیم خاں کو حکم دیا۔ وقف کا صندوق خالی کر دو۔ خالی صندوق چور کو دھوکہ دے گا۔ اصل امانت وہاں رکھو جہاں اذان کی آواز اور اسکول کی گھنٹی ایک ساتھ سنائی دیں۔ اور سنو۔ یہ پیتل کی کنجی اس کمرے کی ہے جو نقشے پر کبھی بنا ہی نہیں..."

خط وہیں ختم ہو گیا۔ باقی حصہ پھٹا ہوا تھا۔

"جہاں اذان اور اسکول کی گھنٹی ایک ساتھ سنائی دیں..." عثمان نے دہرایا۔

"پرانی مسجد اور پرائمری اسکول!" حم za چلایا۔ "دونوں حویلی کے چھپے والی گلی میں ہیں!"

لیکن عمران کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ وہ چھپے ہوئے رہا تھا۔ "تم لوگ نہیں سمجھ رہے... ملک صاحب کو آج رات ہی سب پتہ چل جائے گا۔ میں نے انہیں فون پر بتا دیا تھا کہ تم لوگ کنویں میں اترے ہو۔"

"کیا؟" زارا چیخی۔

"مجھے معاف کر دو! مجھے نوکری کا ڈر تھا!" عمران سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ "اور ایک بات سن لو۔ مشینیں صبح نہیں، آج رات آرہی ہیں! ٹریکٹر گیٹ پر کھڑا ہے!"

وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر غائب ہو گیا۔

"جلدی!" حم za نے مرتبان بیگ میں ڈالا۔ "اوپر چلو!"

وہ ایک ایک کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ عریبہ سب سے آخر میں تھی۔ پیتل کی کنجی اس کی مٹھی میں دبی تھی۔

اور تبھی اوپر سے انجن کی گرج سنائی دی۔ تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کنویں کے منہ پر پڑی۔

پھر ایک سایہ کنویں کے دہانے پر جھکا۔ اور رسی کی سیڑھی، جس سے وہ نیچے اترے تھے، ایک جھٹکے سے اوپر کھینچ لی گئی۔

نیچے اندھیرے میں چاروں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ اوپر انجن دھاڑ رہا تھا۔ اور ان کے پاس واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

رسی کی سیر ہی اوپر کھینچ لی گئی تھی۔

چاروں کنویں کے نیچے کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اوپر انجن دھاڑ رہا تھا اور ہیڈلائٹس کی تیز روشنی کنویں کے منہ پر ناچ رہی تھی۔ زارا کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”اب کیا ہوگا؟“ عثمان کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”ہم یہیں دب کر رہ جائیں گے؟“

”خاموش!“ عربیہ نے ٹارچ کی روشنی طاق کی طرف موڑی۔ ”گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سوچو۔ نواب نے یہ جگہ چھپنے کے لیے نہیں، بچ نکلنے کے لیے بنائی ہوگی۔“

اس نے حمزہ کے بیگ سے مٹی کا مرتبان نکالا۔ وہی جس پر نواب ذوالفقار علی خان کی لال لاکھ کی مہر تھی۔ خط کا بچا ہوا حصہ اس کے دوسرے ہاتھ میں تھا: ”...یہ پیتل کی کنجی اس کمرے کی ہے جو نقشے پر کبھی بنا ہی نہیں...“

”کمرہ جو نقشے پر کبھی بنا ہی نہیں،“ عربیہ نے آہستہ دہرایا۔ ”اگر وہ کمرہ نقشے پر نہیں ہے، تو اس کا دروازہ بھی یہیں کہیں چھپا ہوگا۔“

اس نے پیتل کی کنجی طاق کی پچھلی دیوار کے پتھروں پر پھیری۔ ایک جگہ اس کی انگلیاں رک گئیں۔ کائی کے نیچے ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ بالکل کنجی کے ناپ کا۔

کنجی اندر گئی۔ کٹاک!

طاق کی پچھلی دیوار آہستہ سے ایک طرف سرکنے لگی۔ سچھ ایک تنگ سرنگ منہ کھولے تھی۔ اتنی تنگ کہ ایک وقت میں ایک ہی بچہ گزر سکتا تھا۔ دیواروں میں چھوٹے چھوٹے طاق بنے تھے جن میں کبھی چراغ جلتے ہوں گے۔ اندر سے مٹی اور پرانے تیل کی بو آرہی تھی۔

”نواب کے زمانے کی خفیہ راہداری،“ حمزہ نے سرگوشی کی۔ ”خطرے کے وقت نکلنے کے لیے۔“

حمزہ نے مرتبان اور سنہری مہریگ میں ڈالیں، اور ایک ایک کر کے وہ سرنگ میں گھس گئے۔ عریبہ سب سے آگے، ٹارچ جلائے۔

اوپر، کنویں کے منہ پر، فورین نے ہاتھ اٹھایا۔ ”منہ مٹی سے بند کر دو!“

عمران کا دل زور سے دھڑکا۔ اندر بچے تھے! اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، ”رکو! اندر بچے ہیں! اور... اور فہد تھانے فون کر چکا ہے۔ پولیس آرہی ہے!“

فورین کے ہاتھ رک گئے۔ اسی لمحے گیٹ کی طرف سے ایک لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔
فہد! اس کے ہاتھ میں موبائل تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

”میں نے واقعی تھانے فون کر دیا ہے!“ فہد چلایا۔ ”انسپکٹر صاحب نے کہا
ہے۔ آج رات کوئی مشین نہیں چلے گی!“

فورین نے دانت پیسے۔ ”ٹھیک ہے... صبح اذان کے بعد واپس آئیں گے۔ تب
دیکھتے ہیں کون روکتا ہے۔“ ٹریکٹر کا انجن بند ہوا، مزدور بکھرنے لگے۔

عمران کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ وہ چپ چاپ وہاں سے کھسکا اور پرانی مسجد
کے سنسان صحن میں جا کر ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے آپ
پر غصہ تھا۔ مگر دل میں ہلکی سی خوشی بھی: آج پہلی بار اس نے سچ کا ساتھ دیا
تھا۔

سرنگ ایک زنگ آلود جالی پر ختم ہوئی۔ عربہ نے کندھے سے زور لگایا۔ جالی
چرچراتی ہوئی ایک طرف ہوئی، اور ٹھنڈی تازہ ہوا اندر آئی۔

وہ ایک ایک کر کے باہر نکلے۔ پرانی مسجد کے کچھلے صحن میں! سامنے ٹوٹا ہوا
حوض تھا، اور اس کے پاس ستون سے ٹیک لگائے... عمران بیٹھا تھا۔ اس نے
سراٹھایا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

”تم؟“ حمزہ کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ ”تم نے ہمیں کنویں میں پھنسا دیا تھا!“

”حمزہ، رکو،“ عربیہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”پہلے سوچو۔“ مشینوں کی خبر بھی تو اسی نے دی تھی۔ اور اوپر فورین کیوں رکا؟“

عمران نے نظریں جھکا لیں۔ ”میں نے جھوٹ بولا تھا کہ فہد نے پولیس کو فون کیا ہے۔ پھر فہد واقعی آگیا۔“ اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ ”مجھے معاف کر دو۔ میں ڈر گیا تھا... میری امی کی دوا کے پیسے...“

خاموشی چھا گئی۔ صرف مسجد کی پرانی دیواروں سے کبوتروں کی گھڑ گھوں سنائی دے رہی تھی۔

پھر حمزہ نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”ڈر سب کو لگتا ہے، عمران بھائی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ڈر کے آگے جھکو گے یا سچ کے ساتھ کھڑے ہو گے۔ فیصلہ تمہارا ہے۔“

عمران نے کانپتے ہاتھ سے حمزہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ ”سچ کے ساتھ۔“

”تو سنو،“ عمران نے جلدی سے کہا، آنسو پونچھتے ہوئے۔ ”فورین صبح اذان کے بعد واپس آئے گا۔ مشرقی حصہ۔ جہاں مینار ہیں۔ سب سے پہلے گرایا جائے گا۔ تمہارے پاس صرف آج کی شام ہے۔“

عربیہ نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور اس کی سانس رک گئی۔ سورج
ڈوبنے کو تھا!

“مینار کا سایہ!” وہ چلائی۔ “ڈائری کی بات یاد ہے؟ تین دروازے کھل گئے،
چوتھا چھپا ہے۔ جہاں ڈوبتے سورج کا سایہ مینار سے پتھر پر ٹھہرے، وہیں راز
دبا ہے!”

اسی لمحے مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ اور عربیہ کو خط کی لائن یاد آئی۔ اس نے
گلی کے اس پار اسکول کی عمارت دیکھی، اور بات دل میں محفوظ کر لی۔
“چلو! حمزہ چلایا۔“ میناروں کی طرف!“

عربیہ، حمزہ، عثمان، زارا اور عمران حویلی کے صحن کی طرف بھاگے۔ راستے
میں فہد بھی ان سے آ ملا۔

سورج مغرب میں ایک سنہری تھالی کی طرح جھک چکا تھا۔ لمبے مینار کا سایہ صحن
پر پھیلا ہوا تھا۔ ایک دیو ہیکل کالی انگلی جو اینٹوں پر آہستہ آہستہ رینگ رہی
تھی۔

“سائے کے ساتھ چلو!“ عربیہ نے کہا۔ “جہاں اس کی نوک ٹھہرے گی۔
وہیں!“

وہ سائے کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ کبوتروں کا ایک غول گھبرا کر پھڑپھڑاتا ہوا اڑا۔ سایہ لمبا ہوتا گیا... ہوتا گیا... یہاں تک کہ اس کی نوک ایک پرانے پتھر پر آکر ٹھہر گئی۔

وہ سو کھے حوض کی ٹوٹی ہوئی منڈیر کا ایک حصہ تھا۔ اس پر کائی جمی تھی۔ لیکن کائی کے نیچے کچھ بنا ہوا تھا۔ عربیہ نے ہتھیلی سے کائی صاف کی۔

ایک ہلال اور ایک تلوار۔ نواب کا مہر!

”ہیہیں!“ عثمان کی آواز جوش سے کانپ رہی تھی۔

فہد اور عثمان نے مل کر پتھر کو ہلایا۔ وہ ہلا! نیچے ایک چھوٹا سا خانہ تھا۔ اور اس میں تانبے کا ایک لاکٹ، سبز زنگ میں لپٹا ہوا۔

عربیہ نے کانپتے ہاتھوں سے لاکٹ کھولا۔ اندر کاغذ کا ایک پرزہ تھا، سیاہی مدہم پڑ چکی تھی:

”جو تیسرا نقشہ چاہیے، وہ مینار کی پرانی گھنٹی کے کھوکھلے پیٹ میں دیکھو۔ موم میں لپٹا ہوا، وہاں جہاں اذان سے پہلے پرندے بیٹھتے تھے۔“

سب نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ مینار کی بالکونی میں ایک پرانی پیتل کی گھنٹی لٹک رہی تھی۔ برسوں سے خاموش، مکڑی کے جالوں میں لپیٹی ہوئی۔

اور تبھی۔ ٹک! ایک چھوٹا سا کنکر اوپر سے گرا اور عربہ کے قدموں کے پاس آکر رکا۔

بالکونی پر کوئی کھڑا تھا۔ لمبا سایہ، چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا۔ وہی سایہ جو اس سے پہلے میناروں پر دیکھا گیا تھا!

”وہ نیچے آ رہا ہے!“ زار کی چیخ نکلی۔

سایہ مینار کی بیرونی سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ تیز، بے آواز، جیسے اس کا ہر قدم پہلے سے طے شدہ ہو۔ بچے بے اختیار چپھے ہوئے۔

دھم! وہ صحن میں کودا اور مینار کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ان کے اور گھنٹی کے درمیان۔

اس کے ہاتھ میں کچھ چمکا۔ پیتل کی ایک چابی۔ عربہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ بالکل ویسی ہی چابی، جیسی اس نے ڈائری کے خاکے میں دیکھی تھی۔ گھنٹی والے خانے کی چابی!

عربہ کے ذہن میں ایک بات کوندی۔ اس شام جو چیز دور سے کاغذ جیسی لگی تھی، شاید وہ یہی چابی تھی!

”تمہارے پاس ڈائری ہے نا، لڑکی؟“ سائے کی آواز بھاری اور پرانی تھی۔ ”تو تم نے اس کا خاکہ بھی دیکھا ہوگا۔ اس تالے میں دو چابیاں لگتی ہیں۔“

عربیہ کے ذہن میں خاکہ گھوم گیا۔ ہاں۔ تالے کے دو سوراخ تھے، ایک دوسرے کے برابر! اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

”ایک چابی نواب کے پاس تھی،“ سایہ ایک قدم آگے بڑھا۔ ”دوسری میرے دادا کے پاس۔ انہوں نے یہ حویلی نواب کے ساتھ مل کر بنائی تھی۔ تیسرا نقشہ میری امانت ہے۔ میرے خاندان کا حق!“

سورج ڈوب گیا۔ صحن اندھیرے میں ڈوب گیا۔ صرف پیتل کی گھنٹی کی مدھم چمک باقی رہ گئی۔

سایہ نے زارا کی طرف دیکھا۔ ”دوسری چابی تمہارے دادا ابو کے پاس ہے۔ ان سے پوچھو۔ اس سے پہلے کہ صبح کی مشینیں سب کچھ مٹی میں ملا دیں۔“

اور پھر وہ اندھیرے میں گھل گیا۔ جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔

قسط 7 — صبح کی اذان سے پہلے

رات کا گیارہواں بج رہا تھا اور حویلی کے بڑے صحن میں اندھیرا ایسا چھایا تھا کہ ہلکی سی چاندنی بھی اینٹوں پر ڈرتی ہوئی اتر رہی تھی۔ حمزہ، عربیہ اور عثمان تینوں چپکے چپکے دادا ابو کے کمرے کے دروازے پر آکھڑے ہوئے۔ ان کے چھچھینار کی طرف دیکھنے سے ڈر لگ رہا تھا۔ اسی مینار سے ابھی شام کو وہ سایہ اتر ا تھا، جس نے کہا تھا: دوسری چابی تمہارے دادا ابو کے پاس ہے۔

حمزہ نے ہاتھ کا زور لگا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"دادا ابو؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "آپ جاگ رہے ہیں؟"

اندر سے کچھ دیر خاموشی رہی، پھر لکڑی کی سیڑھی جیسی آواز میں کرسی کھسکی اور دادا ابو نے دروازہ کھولا۔ ان کے چہرے پر وہ تھکاوٹ تھی جو تین دن سے سونہ سکنے والے انسان کے چہرے پر ہوتی ہے۔

"تم تینوں؟ اس وقت؟" انہوں نے سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "اندر آؤ۔"

کمرہ چھوٹا تھا مگر گرم۔ دیوار پر نواب ظفر علی خان کی پرانی تصویر لگی تھی۔ دھندلی مگر اس کا شکار والا ٹوپی اب بھی چمک رہا تھا۔ دادا ابو تخت پر بیٹھ گئے اور تینوں کو اپنے سامنے بٹھایا۔

"ہم مینار گئے تھے، دادا ابو،" حمزہ نے آہستہ کہا۔ "گھنٹی کے کھوکھلے پیٹ میں دیکھنے۔ لیکن وہاں کوئی اور پہنچ گیا۔"

دادا ابو کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"اس نے کیا کہا؟" ان کی آواز اب سرگوشی سے بھی ہلکی تھی۔

عربا نے پوری بات سنائی۔ پیتل کی چابی، دو تالے، اس کا دعویٰ کہ اس کے دادا نے نواب کے ساتھ مل کر حویلی بنائی تھی، اور آخر میں وہ ایک جملہ جواب بھی حمزہ کے کانوں میں گونج رہا تھا: دوسری چابی تمہارے دادا ابو کے پاس ہے۔ کافی دیر دادا ابو کچھ نہ بولے۔ باہر کہیں دور کتے بھونکے، اور ہوا نے کھڑکی کے پردے کو ہلایا۔ پھر انہوں نے آہ بھری۔ ایسی آہ جو سینے کے سب سے گہرے خانے سے نکلتی ہے۔

"اس کا نام سراج تھا،" دادا ابو نے کہا۔ "سراج الدین۔ میرے دادا کے سب سے قریبی دوست۔ حویلی کی اینٹیں انہوں نے مل کر اٹھائی تھیں۔ نواب صاحب کے حکم پر۔"

"تو پھر دشمنی کیسی؟" عثمان نے پوچھا۔

"دشمنی نہیں تھی بیٹا۔ غلط فہمی تھی۔" دادا ابو کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "جب نواب صاحب نے وقف کے کاغذات لکھوائے تو انہوں نے چوتھا دروازہ

صرف سراج کو بتایا تھا۔ حفاظت کے لیے۔ مگر میرے دادا کو لگا کہ ان سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ وہ دن بہ دن دور ہوتے گئے۔ اور پھر ایک رات سراج کا خاندان حویلی چھوڑ کر چلا گیا۔ کوئی نہیں جانتا وہ کہاں گئے۔

"اور دوسری چابی؟" حمزہ نے سانس روک کر پوچھا۔

دادا ابو اٹھے، الماری کے پچھلے حصے سے ایک پرانا لکڑی کا ڈبہ نکالا، اور اسے کھولا۔ اندر زرد پڑے ہوئے خط تھے۔ سب سے نیچے۔ ایک چھوٹی سی پیتل کی چابی، جس پر وہی نقش تھا جو ڈائری کے خاکے میں بنا تھا۔

"یہ چابی میرے دادا کو سراج نے آخری رات دی تھی،" دادا ابو نے کہا۔ "ساتھ ایک خط بھی تھا۔ اس میں لکھا تھا: جب وقت آئے اور دونوں خاندان لکھے ہوں، تب گھنٹی کھلے گی۔ مگر میرے دادا نے اس خط کو کبھی کسی کو نہیں دکھایا۔ شرم کی وجہ سے۔"

عربیا نے خط اٹھایا۔ پیلے کاغذ پر ٹوٹی پھوٹی لکھائی تھی: "دوسرا دروازہ وہاں نہیں جہاں سب دیکھتے ہیں۔ تیسرا نقشہ بتا دے گا کہ چوتھا دروازہ کہاں ہے۔ مگر یاد رکھنا۔ جو نقشہ کھولے، اسے پہلے اپنا دل کھولنا ہوگا۔"

"پہیلی!" عربیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "جو نقشہ کھولے اسے پہلے اپنا دل کھولنا ہوگا۔ یعنی نقشے کو کھولنے سے پہلے کوئی شرط پوری کرنی ہوگی۔ شاید نقشہ صرف تب نظر آئے جب۔"

اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ باہر صحن میں اچانک روشنی چمکی۔ ٹارچ کی روشنی! اور ساتھ ہی دبی ہوئی آوازیں۔

"بلڈر ملک کے آدمی!" عثمان کھڑکی کی طرف لپکا۔ "وہ اذان سے پہلے آگئے!"
 دادا ابو نے چابی حمزہ کی مٹھی میں دبا دی۔ "جاؤ! گھنٹی تک پہنچو۔ میں انہیں روکتا ہوں۔"

"مگر دادا ابو۔"

"جاؤ!" ان کی آوازیں وہ سختی تھی جو حمزہ نے پہلی بار سنی تھی۔

تینوں اندھیرے صحن میں نکلے۔ مینار کی سیڑھیاں پتھر کی اور ٹھنڈی تھیں۔ ہر قدم پر دل دھڑک رہا تھا۔ اوپر گھنٹی کے کمرے میں پہنچے تو دیکھا۔ گھنٹی وہیں لٹکی تھی، پرانی، سبز رنگ کی کائی سے ڈھکی۔ اس کے پیٹ میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا، اور سوراخ کے اوپر دو تالے۔ دو پیتل کے تالے، بالکل ایک جیسے۔

حمزہ نے کانپتے ہاتھوں سے دادا ابو والی چابی ایک تالے میں ڈالی۔ کلک۔ تالا کھل گیا۔

مگر دوسرا تالا؟ دوسری چابی تو اس سائے کے پاس تھی!

اسی لمحے سیرڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ تینوں کے دل حلق میں آ گئے۔ مگر جو اوپر آیا وہ بلڈر ملک کا آدمی نہیں تھا۔ وہی سایہ تھا، چہرے پر کپڑا لپٹا، ہاتھ میں دوسری پیتل کی چابی۔

"تم آ گئے،" اس نے کہا۔ "میرے دادا نے کہا تھا۔ ایک دن دونوں خاندان اکٹھے ہوں گے۔"

اس نے اپنی چابی دوسرے تالے میں ڈالی۔ کلک۔

دونوں نے مل کر گھنٹی کے پیٹ کا ڈھکن کھولا۔ اندر۔ موم میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا رول۔ تیسرا نقشہ!

حمزہ نے موم توڑا اور کاغذ کھولا۔ عریبا نے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ اور پھر تینوں کی سانسیں رک گئیں۔

نقشے پر حویلی بنی تھی۔ مگر وہ حویلی جو وہ جانتے تھے، اس سے الگ۔ اس میں چوتھا دروازہ نشان زد تھا۔ اور وہ دروازہ حویلی میں نہیں تھا۔ وہ اس جگہ تھا جہاں... جہاں بلڈر ملک کی مشینیں کھڑی تھیں۔ اس خالی پلاٹ پر جہاں وہ نیا پلازہ بنانا چاہتا تھا۔

"چوتھا دروازہ حویلی کے باہر ہے،" عربیہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ "نقشہ کہہ رہا ہے۔ خزانہ کبھی حویلی میں تھا ہی نہیں۔"

اسی وقت نیچے سے انجنوں کی گرج سنائی دی۔ اور پھر۔ دور مسجد سے فجر کی اذان کی پہلی صدا بلند ہوئی: اللہ اکبر...
مشینیں آچکی تھیں۔

فجر کی اذان کی صدا ابھی فضا میں تھی اور خالی پلاٹ پر بلڈر ملک کی مشینیں دھاڑ رہی تھیں۔ حمزہ نے نقشہ مٹھی میں بھینچا۔ عربا کی ٹارچ کی روشنی نقشے کے اس نشان پر تھی جو اب ان کی زندگی کا سب سے اہم نشان بن چکا تھا۔ چوتھا دروازہ، حویلی سے باہر، اسی پلاٹ پر۔

"نیچے چلو!" حمزہ نے کہا۔ "دادا ابو انہیں روکیں گے۔ ہمیں دروازہ ڈھونڈنا ہے۔"

وہ سایہ۔ جس نے اب اپنا چہرہ کھول دیا تھا۔ ان کے ساتھ تھا۔ چاندنی میں اس کا چہرہ عام سا تھا: تیس پینتیس سال کا آدمی، آنکھوں کے گرد تھکن کی لکیریں۔ "میرا نام فرحان ہے،" اس نے سیرٹھیاں اترتے ہوئے کہا۔ "سراج الدین میرے دادا تھے۔"

"تو تم...؟" عثمان ہانپ رہا تھا، "تم ہمارے دشمن نہیں ہو؟"

فرحان رکا۔ مینار کے نیچے اندھیرے میں اس کی آواز بھاری تھی۔ "میرے دادا نے آخری رات تمہارے دادا کو خط لکھا تھا۔ جب دونوں خاندان اکٹھے ہوں، تب گھنٹی کھلے گی۔ تین نسلوں تک ہم اس خط کا انتظار کرتے رہے۔ میرے ابا کہتے تھے نواب کے خاندان نے ہمیں دھتکار دیا۔ شرم نے دونوں طرف

دیواریں کھڑی کر دیں۔" اس نے حمزہ کی طرف دیکھا۔ "مگر آج رات... آج رات دونوں خاندان اکٹھے ہیں۔ خط کی شرط پوری ہو گئی۔"

عربا نے دھیرے سے کہا: "جو نقشہ کھولے، اسے پہلے اپنا دل کھولنا ہوگا۔" یہی تھا پہیلی کا مطلب۔ نقشہ تب ہی کھلا جب تم نے سچ بتایا۔"

وہ پلاٹ پر پہنچے۔ مٹی کا بڑا میدان، بیچ میں بلڈوزر، اس کے پیچھے دو ٹرک۔ مشینوں کی ہیڈلائٹس نے صبح کے دھندلکے کو چیر رکھا تھا۔ ڈرائیور کیبن میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"نقشہ کہتا ہے دروازہ یہیں ہے،" عربا نے نقشہ زمین پر بچھایا۔ "دیکھو۔ یہ نشان... یہ تو باؤلی کا نشان ہے! پرانی سیرڑھیوں والی باؤلی!"

"باؤلی؟" حمزہ نے چاروں طرف دیکھا۔ "یہاں تو کوئی باؤلی نہیں۔"

"تھی،" فرحان نے کہا۔ وہ پلاٹ کے ایک کونے کی طرف بڑھا جہاں زمین ذرا دھنسی ہوئی تھی۔ "میرے دادا بتاتے تھے۔ نواب صاحب کے زمانے میں یہاں حویلی کی باؤلی تھی۔ ساٹھ سال پہلے اسے مٹی سے بھر دیا گیا تھا۔" اس نے دھنسی ہوئی جگہ پر پاؤں مارا۔ زمین کھوکھلی بجی۔ "یہیں۔"

اسی لمحے حویلی کی طرف سے شور اٹھا۔ دادا ابو صحن میں کھڑے تھے، ہاتھ میں موبائل فون بلند کیے۔ "رکو!" ان کی آواز لاؤڈ اسپیکر جیسی گونجی۔ "ایک منٹ رکو اور یہ سنو!"

فورین نے ہاتھ اٹھایا۔ بلڈوزر کا انجن دھیمہ ہوا۔

دادا ابو نے فون کا بٹن دبایا۔ ایک آواز گونجی۔ فہد کی آواز: "...ملک صاحب نے کہا تھا، کاغذات والا معاملہ دبا دو۔ وقف کے کاغذات اگر عدالت پہنچ گئے تو پلازہ کا منصوبہ ختم۔ انہوں نے کہا تھا حویلی گرنے کے بعد کوئی ثبوت نہیں بچے گا..."

سنناٹا چھا گیا۔ فورین نے بلڈوزر کے ڈرائیور کو دیکھا۔ ڈرائیور نے سگریٹ بجھا دی۔

"یہ... یہ ریکارڈنگ عدالت میں چلے گی،" دادا ابو نے کہا۔ ان کی آواز اب پرسکون تھی۔ "مگر میں عدالت نہیں جانا چاہتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آج کوئی مشین نہ چلے۔ بس آج کا دن۔"

فورین نے ہیلمٹ اتارا۔ "...آج کا دن۔ بس۔"

حمزہ نے سکون کی سانس لی۔ مگر عربیہ پہلے ہی دھنسی ہوئی زمین کھود رہی تھی۔
فرحان نے جیب سے ایک چھوٹا سا بیلچہ نکالا۔ "ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں،" اس
نے مسکرا کر کہا۔ "دادا کی عادت تھی۔"

دس منٹ کی کھدائی کے بعد بیلچہ پتھر سے ٹکرایا۔ انہوں نے مٹی ہٹائی۔ اور
وہاں تھا: ایک بڑا چوکور پتھر، اس پر وہی نقش جو ڈائری میں بنا تھا۔ چار
دروازے، چاروں ایک دائرے میں۔

"چوتھا دروازہ،" عثمان نے سرگوشی کی۔

مگر پھر عربیہ کی ٹارچ کی روشنی پتھر کے نیچے میں رکی۔ وہاں تالے نہیں تھے۔
ایک بھی نہیں۔ صرف ایک گول نشان تھا، ہتھیلی کے سائز کا، اور اس کے گرد
لکھا تھا:

"چاروں دروازے ایک دل میں کھلتے ہیں۔"

"اس کا کیا مطلب ہے؟" حمزہ نے پوچھا۔

فرحان نے گہری سانس لی۔ اس نے اپنی ہتھیلی اس نشان پر رکھی۔ کچھ نہ
ہوا۔ حمزہ نے رکھی۔ کچھ نہ ہوا۔ عربیہ نے رکھی۔

پتھر گرم تھا۔

"یہ... یہ گرم ہے،" عربیانے کہا۔ "نیچے کوئی ہے؟"

اسی لمحے زمین ہلی۔ ہلکی سی۔ اتنی کہ صرف وہی محسوس کر سکیں جو پتھر پر ہاتھ رکھے تھے۔ پھر پتھر کے نیچے سے آواز آئی: پتھر پر پتھر رگڑنے کی آواز۔

پتھر ڈھلکنے لگا۔ آہستہ آہستہ، ایک طرف جھک کر۔ نیچے سیڑھیاں نظر آئیں، اندھیرے میں اترتی ہوئی۔

"کوئی اندر سے کھول رہا ہے،" فرحان کی آواز کانپ رہی تھی۔

اور پھر۔ نیچے سے روشنی آئی۔ چراغ کی روشنی۔ ہلتی ہوئی، گرم، زندہ۔

نیچے کوئی چراغ جلانے بیٹھا تھا۔ کوئی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ شاید ساٹھ سال سے۔

"السلام علیکم،" نیچے سے ایک بوڑھی آواز آئی۔ "میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

سیڑھیاں پتھر کی تھیں۔ گیلی، پھسلن والی، اندھیرے میں اترتی ہوئی۔ حمزہ سب سے آگے تھا، عربا کی ٹارچ اس کے کندھے کے اوپر سے روشنی ڈال رہی تھی۔ فرحان ان کے پیچھے، اور عثمان سب سے آخر میں، بار بار اوپر دیکھتا ہوا۔ جہاں صبح کی روشنی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اب بھی نظر آ رہا تھا۔

نیچے چراغ کی روشنی ہل رہی تھی۔ گرم، زندہ۔

”السلام علیکم،“ وہی بوڑھی آواز پھر آئی۔ قریب سے، صاف۔ ”میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

سیڑھیاں ایک چھوٹے سے کمرے میں کھلتی تھیں۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک چارپائی، دیوار کے ساتھ لکڑی کی الماریاں جن میں پرانے رجسٹر ٹھنسنے ہوئے تھے، اور بیچ میں ایک میز۔ میز پر پیتل کا چراغ جل رہا تھا۔

چراغ کے پیچھے ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ اتنا بوڑھا کہ اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ چہرے پر جھریوں کے جال، ہاتھ کانپتے ہوئے، مگر آنکھیں صاف۔ حیران کن حد تک صاف۔

”آؤ، بیٹھو،“ اس نے کہا۔ ”ساٹھ سال سے میں یہی سوچتا رہا ہوں کہ جب تم آؤ گے تو میں کیا کہوں گا۔ اور اب تم آ گئے ہو، اور میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔“

”آپ... آپ کون ہیں؟“ حمزہ نے پوچھا۔

”میرا نام نذیر احمد ہے،“ بوڑھے نے کہا۔ ”ساٹھ سال پہلے میں اس حویلی میں باورچی کا بیٹا تھا۔ جس دن باؤلی بھری گئی تھی، میں نیچے تھا۔ وقف کے کاغذات بچانے آیا تھا۔ مٹی اوپر سے گرنے لگی، اور... میں اوپر نہ جاسکا۔ سب نے سمجھا میں مر گیا۔“ اس نے مسکرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ”ایک طرح سے وہ سچ بھی تھا۔ نذیر احمد اوپر کی دنیا کے لیے اسی دن مر گیا تھا۔“

عریبا کی سانس رک گئی۔ ”وقف کے کاغذات؟ آپ کے پاس ہیں؟“

نذیر نے میز کے نیچے سے لوہے کا ایک صندوق نکالا۔ پرانا، زنگ آؤد، مگر تالا مضبوط۔ اس نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی اتاری۔ بھاری، پیتل کی، اس پر مہر کندہ تھی۔

”تیسرا ٹکڑا،“ فرحان نے سرگوشی کی۔

”ٹکڑا نہیں، بیٹا،“ نذیر نے کہا۔ ”مہر۔ یہ نقشے کے ٹکڑے کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ وقف کی تین مہریں تھیں۔ نواب صاحب کے زمانے کی۔ دو تمہارے دادا

کے پاس تھیں، حمزہ۔ تیسری میرے پاس۔ ”اس نے انگوٹھی تالے میں گھمائی۔
صندوق کھلا۔

اندر۔ خالی۔

صرف ایک کاغذ تھا، تہہ کیا ہوا۔ نذیر نے اسے کھولا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔
”یہ... یہ یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ اس کی آواز بدل گئی۔ ”کل رات تک
وقف نامہ یہیں تھا۔ اسی صندوق میں۔ میں نے خود رکھا تھا۔“

”کل رات؟“ عثمان نے پوچھا۔ ”یعنی کوئی آیا تھا؟“

نذیر نے چراغ اٹھایا اور فرش کی طرف روشنی کی۔ مٹی پر نشان تھے۔ جوتوں
کے نشان۔ چھوٹے نہیں، بڑے نہیں۔ عام۔ مگر وہ ان کے نہیں تھے۔ ان
کے جوتے ابھی خشک مٹی پر تھے؛ یہ نشان پرانی، جمی ہوئی مٹی میں دھنسے
ہوئے تھے۔

”یہ نشان،“ عربیہ نے جھک کر دیکھا، ”کل رات کے ہیں۔ مٹی ابھی تک نم
ہے۔“

نشان کمرے کے پچھلے حصے کی طرف جاتے تھے۔ دیوار میں ایک دراڑ تک۔
دراڑ اتنی چوڑی تھی کہ ایک آدمی بمشکل گزر سکے۔ اس کے پار اندھیرا تھا۔

”یہ دراڑ، ”فرحان نے کہا، ”یہ کہاں جاتی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم، ”نذیر نے کہا۔ اس کی آواز میں اب خوف تھا۔ ساٹھ سال میں پہلی بار۔ ”ساٹھ سال میں میں نے کبھی اس کے پار جانے کی ہمت نہیں کی۔“

حمزہ نے ٹارچ دراڑ میں ڈالی۔ روشنی ایک تنگ سرنگ میں گئی۔ اور سرنگ کے فرش پر کچھ چمکا۔

”وہاں کچھ ہے، ”اس نے کہا۔

وہ دراڑ میں گھسا۔ عریبا اس کے چپھے۔ سرنگ صرف چند قدم لمبی تھی۔ اور اس کے آخر میں، پتھر پر رکھا ہوا، ایک دوسرا چراغ تھا۔ بجھا ہوا، مگر ابھی گرم۔

”یہ میرا نہیں ہے، ”نذیر کی آواز ان کے چپھے سے آئی۔ وہ دراڑ کے اس پار کھڑا کانپ رہا تھا۔

اسی لمحے سرنگ کے آگے والے اندھیرے سے آواز آئی۔ قدموں کی۔ قریب آتے ہوئے۔

ٹارچ کی روشنی میں ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ ان کی عمر کی۔ سولہ سترہ سال۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانا کاغذ تھا، مہر لگا ہوا۔ وقف نامہ۔

”رکو!“ اس نے کہا۔ ”مت چھوٹا اسے۔ یہ تمہارے کسی کام کا نہیں۔“

اس کی آواز میں وہی لہجہ تھا جو عربیہ نے پہیلیاں سلجھاتے وقت اپنایا تھا۔
ڈرا ہوا، مگر ہار ماننے کو تیار نہیں۔ حمزہ نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے سے
ہٹا دی تاکہ وہ چندھیانہ جائے۔

”تم کون ہو؟“ حمزہ نے نرمی سے پوچھا۔

لڑکی نے وقف نامہ سینے سے لگایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، مگر آواز
مضبوط تھی۔

”جب تک تمہیں یہ نہ پتا چلے کہ یہ وقف کس کے نام ہے، یہ کاغذ ردی ہے،“ اس
نے کہا۔ ”نواب ذوالفقار علی خان نے حویلی خریدی تھی۔ بنوائی نہیں تھی۔
اصل وقف کرنے والا کوئی اور تھا۔“

اس نے رکا، اور پھر وہ الفاظ کہے جن سے کمرے کی ہوا رک گئی:

”اور اس کا وارث... اب بھی زندہ ہے۔“

حمزہ نے ٹارچ دراڑ میں ڈالی اور اندر گھس گیا۔ عریبا اس کے چپھے پھر فرحان۔ سرنگ صرف چند قدم لمبی تھی۔ تنگ، گیلی، مٹی کی بو سے بھری۔ اور اس کے آخر میں ایک نیچی محرابی کوٹھری تھی۔

حمزہ نے ٹارچ گھمائی۔ اور اس کی سانس رک گئی۔

یہ کوئی عام کوٹھری نہیں تھی۔ دیواروں کے ساتھ لکڑی کی الماریاں تھیں، جن میں پرانے رجسٹر اور بہیاں ٹھنسی ہوتی تھیں۔ بیچ میں پتھر کی ایک میز تھی۔ اور میز پر۔

”وقف نامہ،“ عریبا نے سرگوشی کی۔

وہی کاغذات جنہیں نذیر احمد نے ساٹھ سال سے اپنے صندوق میں سنبھال رکھا تھا۔ وہیں پڑے تھے۔ کھلے، جیسے کسی نے ابھی انہیں پڑھا ہو اور جلدی میں چھوڑ گیا ہو۔

”مگر نذیر چاچا نے کہا تھا یہ چوری ہو گئے تھے،“ فرحان نے کہا۔ ”تو چور انہیں یہیں کیوں چھوڑ گیا؟“

عربیا میز کے قریب گئی۔ اس نے کاغذات احتیاط سے پلٹے۔ ”دیکھو۔ آخری صفحہ غائب ہے۔ پھاڑا گیا ہے۔ کنارے ابھی تازہ ہیں۔“

حمزہ کی نظر میز کے کونے پر پڑی۔ وہاں ایک موبائل فون رکھا تھا۔ اسکرین روشن۔ اس نے اٹھایا۔

اسکرین پر ایک تصویر کھلی تھی: پھٹے ہوئے صفحے کی تصویر۔ اور اس کے نیچے لکھا تھا: ”بھیجا گیا M-کو، دس منٹ پہلے۔“

”دس منٹ پہلے،“ حمزہ نے دہرایا۔ ”یعنی وہ ابھی یہیں تھا۔ جب ہم اوپر کھدائی کر رہے تھے، وہ یہیں نیچے تھا۔“

فرحان نے فون لیا اور رابطوں میں دیکھا۔ ”M“ کے نام سے صرف ایک نمبر تھا۔ کوئی نام نہیں، کوئی تصویر نہیں۔

”عربیا،“ حمزہ نے کہا، ”تم مہروں والی بات دیکھو۔ نذیر چاچا نے کہا تھاتین مہریں تھیں۔“

عربیا نے وقف نامے کا مہر والا صفحہ ڈھونڈا۔ اس پر چار گول دائرے بنے تھے۔ چار مہروں کی جگہ۔ تین میں مہر کے نشان تھے۔ چوتھا خالی تھا۔

”تین مہریں لگی ہیں،“ عریبا نے کہا۔ ”دو تو ہم جانتے ہیں۔ دادا ابو کے خاندان کی، اور نذیر چاچا کی انگوٹھی والی۔ مگر تیسری...“ اس نے ٹارچ قریب کی۔ ”یہ مہر نہ دادا ابو والی ہے، نہ نذیر چاچا والی۔ یہ کوئی تیسری مہر ہے۔“

”اور چوتھی جگہ خالی ہے،“ فرحان نے کہا۔ ”وقف کے کاغذات میں چار دروازوں کا ذکر تھا۔ چار دروازے، چار مہریں۔ تین مل گئیں۔ چوتھی...“

”میناروں والی شخصیت کے پاس،“ حمزہ نے آہستہ کہا۔ ”جسے ہم نے تیسرے ٹکڑے کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ دراصل مہر لیے پھر رہا تھا۔“

اسی لمحے کو ٹھہری کے اندھیرے کونے میں ایک تیلی جلی۔
تینوں ساکت ہو گئے۔

تیلی کی روشنی میں ایک چہرہ ابھرا۔ عورت کا چہرہ۔ پچاس کے لگ بھگ، بال سفید، آنکھیں تیز۔ اس نے تیلی سے ایک موم بتی جلائی اور میز پر رکھی۔

”تم لوگ بہت دور آ گئے ہو، بچو،“ اس نے کہا۔ اس کی آواز پر سکون تھی۔
خطرناک حد تک پرسکون۔

”آپ کون ہیں؟“ حمزہ نے پوچھا۔ اس نے عریبا کو اپنے چہرے پر لیا۔

”میرا نام رضیہ ہے۔“ اس نے وقف نامے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ کاغذات... یہ میرے خاندان کی بربادی کی دستاویز ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

رضیہ نے موم بتی کی روشنی میں کاغذات دیکھے۔ ”نواب ذوالفقار علی خان نے یہ وقف اس زمین پر کیا تھا جو میرے پردادا کی تھی۔ کہتے ہیں انہوں نے زمین ’خریدی‘ تھی۔ میرے خاندان کے پاس اس کے ثبوت تھے۔ اصل ملکیت کے کاغذات۔“ اس نے تلخی سے مسکرایا۔ ”وہ ثبوت اسی پھٹے ہوئے صفحے پر تھے۔ جو صفحہ اب میرے پاس ہے۔“

اس نے جیب سے تہہ کیا ہوا صفحہ نکالا۔

”تو آپ چور ہیں!“ فرحان نے کہا۔

”میں وارث ہوں،“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”اور میں یہاں بلڈر ملک کے لیے نہیں آئی۔ وہ بے وقوف سمجھتا ہے میں اس کے لیے کام کرتی ہوں۔ اس نے مجھے اس وقف نامے کی تلاش میں لگایا تھا۔ تاکہ وہ اسے دبا سکے۔ مگر جب مجھے یہ ملا تو میں نے پڑھا۔ اور میں نے جانا کہ یہ صرف اس کا کھیل نہیں۔ یہ میرے خاندان کا حق ہے۔“

عربیا نے ہمت کی۔ ”تو آپ ہمیں کیوں بتا رہی ہیں؟ آپ تو بھاگ سکتی تھیں۔“

رضیہ نے اسے دیکھا۔ ”کیونکہ تم بچے ہو۔ اور کیونکہ...“ اس نے رکا۔ ”کیونکہ ساٹھ سال پہلے اسی کو ٹھہری میں میرے ابا نے نذیر احمد کو دھوکہ دیا تھا۔ میرے ابا نے اسے نیچے بھیجا تھا کاغذات بچانے کے لیے۔ اور پھر باؤلی بھروادی تھی۔ نذیر کو زندہ دفن کر دیا تھا۔“

سنناٹا چھا گیا۔

”میرے ابا نے سوچا تھا کاغذات ہمیشہ کے لیے دب جائیں گے،“ رضیہ نے کہا۔ ”مگر نذیر زندہ بچ گیا۔ اور کاغذات بھی۔“ اس نے پھٹا ہوا صفحہ موم بتی کے شعلے کے قریب کیا۔ ”اور اب یہ صفحہ بھی نہیں بچے گا۔ چوتھا دروازہ کھلنے سے پہلے یہ راکھ ہو جائے گا۔“

”نہیں!“ حمزہ آگے بڑھا۔

مگر اسی لمحے دراڑ کی طرف سے ایک زوردار آواز آئی۔ پتھر پر پتھر گرنے کی۔ کوٹھری کا واحد راستہ۔ وہ تنگ دراڑ۔ باہر سے بند ہو رہی تھی!

”عثمان!“ فرحان چلایا۔ ”نذیر چاچا!“

باہر سے نذیر کی گھبرائی ہوئی آواز آئی، ”بچو! چپھے ہٹو! وہ... وہ اوپر سے مٹی گرا رہا ہے!“

”کون؟“ حمزہ نے چیخ کر پوچھا۔

جواب میں ایک جانی پہچانی ہنسی آئی۔ بھاری، خود اعتماد۔
بلڈر ملک۔

”رضیہ بیگم،“ اس کی آواز دراڑ کے پار سے آئی، ”تم نے اپنا کھیل کھیل لیا۔ اب میری باری۔ یہ بچے اور یہ کاغذات — سب یہیں دب جائیں گے۔ اور صبح میری مشینیں چلیں گی۔“

رضیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”ملک... تم نے کہا تھا تم صرف کاغذات چاہتے ہو!“
”میں نے بہت کچھ کہا تھا، بیگم۔“

مٹی گرنے کی آواز تیز ہو گئی۔ دراڑ سکڑتی جا رہی تھی۔ عربیا نے حمزہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”حمزہ،“ اس نے سرگوشی کی، ”مہر والا صفحہ دیکھو۔ چوتھی مہر کی جگہ... وہ خالی نہیں ہے۔“

حمزہ نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ چوتھے دائرے میں۔ اتنا ہلکا کہ پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ ایک مہر کا دھندلا نشان تھا۔ اور اس کے نیچے، چھوٹے حروف میں لکھا تھا:

”چوتھی مہر اس کے پاس ہے جو دروازہ بند کرے۔“

حمزہ نے رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ نے حمزہ کی طرف۔

اور دونوں ایک ساتھ سمجھے۔ چوتھی مہر بلڈر ملک کے پاس تھی۔ وہی جواب دروازہ بند کر رہا تھا۔

مٹی گرنے کی آواز اب گرج میں بدل چکی تھی۔

دراڑ۔ کوٹھری کا واحد راستہ۔ آنکھوں کے سامنے سکڑ رہی تھی۔ اوپر سے گرتی مٹی کی بو ہوا میں گھل گئی تھی، اور موم بتی کا شعلہ ڈر کے مارے ہل رہا تھا۔

رضیہ کے ہاتھ میں تہہ کیا ہوا صفحہ تھا۔ موم بتی کے شعلے سے صرف ایک بالشت دور۔

"رضیہ بی بی!" حمزہ کی آواز پھٹ گئی۔ "رکیں!"

"چھپ، ہٹو، بچے،" رضیہ نے کہا۔ مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"آپ کے ابا نے ساٹھ سال پہلے اسی کوٹھری میں ایک زندہ آدمی دفن کیا تھا،" حمزہ نے کہا۔ "تذیر چاچا آج بھی یہیں ہیں۔ کیا آپ وہی دہرائیں گی؟"

"یہ صفحہ میرے خاندان کی عزت ہے،" رضیہ نے کہا۔ "میرے پردادا کی زمین تھی یہ۔ نواب صاحب نے کہا تھا 'خریدی' ہے، مگر قیمت کبھی پوری ادا نہیں کی۔"

"تو جلانے سے عزت واپس آجائے گی؟" عربیا نے کہا۔ "یہ صفحہ چوتھے دروازے کی کنجی ہے۔ چوتھے کا پتا اسی پر ہے۔ اسے جلایا تو چوتھا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔"

باہر سے بلڈر ملک کی آواز آئی، مٹی کی گرج کے پار: "رضیہ بیگم! فیصلہ کر لو۔ صفحہ یا تمہاری جان!"

رضیہ نے شعلے کی طرف دیکھا، پھر حمزہ کی طرف۔

اس نے آہستہ سے ہاتھ چھپے کھینچ لیا۔

"میرے ابا نے بھی یہی سوچا تھا،" اس نے کہا۔ "کہ مٹی سب کچھ دبا دے گی۔ مگر مٹی نے کچھ نہیں دبایا۔ نہ نذیر کو، نہ کاغذات کو، نہ سچ کو۔"

اس نے صفحہ کھولا اور پڑھنے لگی۔

"یہ میرے پردادا میاں فضل الدین کی ملکیت کی دستاویز ہے،" رضیہ نے پڑھا۔ "زمین ان کی تھی۔ نواب صاحب نے خریداری کا معاہدہ کیا، مگر قیمت پوری ادا نہ ہو سکی۔ اس لیے دونوں نے فیصلہ کیا: زمین نہ میری، نہ تمہاری۔ زمین وقف۔"

"مستترکہ وقف،" عربیا نے سرگوشی کی۔ "اسی لیے وقف نامے پر تین مہریں ہیں! ایک نواب صاحب کے خاندان کی۔ دادا ابو والی۔ ایک نذیر چاچا کی

انگوٹھی والی۔ اور تیسری... اس نے رضیہ کی طرف دیکھا۔ "تیسری آپ کے خاندان کی۔"

رضیہ نے سر ہلایا۔ "میرے ابا نے یہ سچ چھپایا۔ نذیر کو دھوکہ دیا، باؤلی بھروا دی، اور تیسری مہر اپنے پاس رکھ لی۔ وہ مہر آج میرے پاس ہے۔"

"اور چوتھی مہر؟" فرحان نے پوچھا۔

رضیہ نے صفحے کا آخری حصہ پڑھا: "چار دروازے، چار مہریں۔ چوتھی مہر امانت دار کے پاس۔ اس کے پاس جو دروازے بند کرے اور کھولے۔"

"چوتھی مہر اس کے پاس ہے جو دروازہ بند کرے،" حمزہ نے دہرایا۔ وہی الفاظ جو مہر والے صفحے پر لکھے تھے۔ "رضیہ بی بی... یہ 'M' کون ہے؟ جسے آپ نے اس صفحے کی تصویر بھیجی تھی؟"

"M... ملک،" رضیہ نے کہا۔ "میں نے اسے تصویر بھیجی تھی۔ دس منٹ پہلے۔ اسی نے مجھے اس کام پر لگایا تھا۔ مگر وہ مجھے بھی یہیں دفنانا چاہتا تھا۔ میں اس کی ملازم نہیں تھی، بچو۔ میں اس کا اگلا شکار تھی۔"

"میناروں پر جو سایہ ہم نے دیکھا تھا،" عربیہ نے آہستہ کہا، "وہ... آپ تھیں؟"

رضیہ نے سر جھکایا۔ "میں تھی۔ میں مشرقی مینار پر نظر رکھے تھی۔ کیونکہ چوتھا دروازہ اسی کی بنیاد کے نیچے ہے، وہاں جہاں وقف کی پہلی اینٹ رکھی گئی تھی۔"

اسی لمحے مٹی کا ایک بڑا ڈھیر دراڑ میں گرا۔ راستہ اب صرف ایک ہاتھ چوڑا رہ گیا تھا۔ باہر سے نذیر چاچا چلایا: "بچو! وہ پوری ٹرالی الٹ رہا ہے!"

"ہم نہیں نکل سکتے!" فرحان نے کہا۔ "دراڑ بند ہو رہی ہے!"

حمزہ کی نظر موم بتی کے شعلے پر پڑی۔ شعلہ ایک طرف جھکا تھا۔ اور اس کا دھواں اوپر اٹھ کر محرابی چھت کے ایک تاریک شگاف کی طرف کھنچ رہا تھا۔

"دھواں دیکھو!" حمزہ چلایا۔ "وہاں پرانا ہوا دان ہے!"

دیوار کے ساتھ لگی الماریاں شگاف کے بالکل نیچے تھیں۔ عریبا فوراً الماری پر چڑھی۔ لکڑی پرانی تھی مگر مضبوط۔ اور شگاف میں ہاتھ ڈالا۔

"یہاں پتھر کی سیل بل رہی ہے!" اس نے زور لگایا۔ سیل سرکی، اور پیچھے ایک ترچھی نالی نظر آئی، اتنی چوڑی کہ بچہ رینگ کر گزر سکے۔

"پرانے زمانے کی ہوا کی نالی!" نذیر چاچا دراڑ کے پار سے چلایا۔ "جلدی کرو، بچو!"

ایک ایک کر کے وہ نالی میں رینگے۔ پہلے عربیا، پھر فرحان، پھر رضیہ، سب سے آخر میں حمزہ، وقف نامے کے کاغذات قیض میں لپیٹے آگے دھکیلتا ہوا۔ اس کے پیچھے دھماکہ ہوا۔ دراڑ مکمل بند ہو گئی۔ کوٹھری مٹی تلے دب چکی تھی۔

ناالی حویلی کے پرانے باورچی خانے کے کھنڈر صحن میں کھلتی تھی۔ چاروں مٹی میں اٹے، ہانپتے ہوئے باہر نکلے۔

"حمزہ! عثمان دوڑتا آیا۔ پیچھے نذیر چاچا، آنکھوں میں آنسو۔

"ہم نے سمجھا تھا تم دب گئے،" نذیر کی آواز ٹوٹ گئی۔

"ابھی نہیں، نذیر چاچا،" حمزہ نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی کہانی باقی ہے۔"

نذیر کی نظر رضیہ پر پڑی۔ "رضیہ؟ فضل الدین کی پڑپوتی؟"

"جی، نذیر چاچا،" رضیہ نے کہا۔ "میرے ابا نے آپ کو اسی مٹی تلے دفن کیا تھا۔ میں معافی مانگنے نہیں آئی۔ میں حساب چکانے آئی ہوں۔"

اس نے تہہ کیا ہوا صفحہ نکالا اور حمزہ کی طرف بڑھایا۔ "یہ اب تم سنبھا لو گے۔ میرے پاس یہ صرف انتقام تھا۔ تمہارے پاس یہ انصاف بن سکتا ہے۔"

حمزہ نے صفحہ لیا اور اسے وقف نامے کے ساتھ رکھا۔ پھٹا ہوا صفحہ اپنی جگہ پر، جیسے ساٹھ سال کا زخم آخر کار بھر گیا ہو۔

"اب سنیں،" عریبا نے کہا۔ "ہمارے پاس تین مہریں ہیں۔ دادا ابو والی، نذیر چاچا والی، اور رضیہ بی بی والی۔ مگر چوتھا دروازہ تبھی کھلے گا جب چاروں مہریں چاروں دائروں میں لگیں گی۔"

"اور چوتھی مہر،" حمزہ نے آہستہ کہا، "اس کے پاس ہے جو دروازہ بند کرے۔" "بلڈر ملک،" فرحان نے کہا۔ "وہی جو ابھی ہمیں زندہ دفنانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

عریبا نے سانس روکی۔ "رکو! اس دن جب وہ حویلی کے پھاٹک پر دھمکیاں دینے آیا تھا، اس کی انگلی میں ایک بھاری مہر والی انگوٹھی تھی۔ وہ اسے بار بار گھما رہا تھا۔" اس نے چوتھے دھندلے دائرے کی طرف دیکھا۔ "یہ نشان... یہ اسی انگوٹھی کی مہر کا ہے۔"

"تو چوتھی مہر اس کی انگلی میں ہے،" حمزہ نے کہا۔ "ہمیں چوتھا دروازہ کھولنے کے لیے وہ انگوٹھی چاہیے۔ آج رات، اس سے پہلے کہ صبح اس کی مشینیں چلیں۔"

فرحان نے جیب تھپتھپائی۔ "اور اس کا اعتراف۔ ریکارڈنگ محفوظ ہے۔ صبح پولیس کے سامنے یہی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہوگا۔"

"مگر صبح تک انتظار نہیں کر سکتے،" رضیہ نے کہا۔ "میں نے اسے صفحے کی تصویر بھیجی تھی۔ وہ صبح کا انتظار نہیں کرے گا۔"

اسی لمحے عثمان دیوار پر سے بھسلتا ہوا نیچے آیا۔ وہ پہرے پر تھا۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔

"مشرقی مینار کی طرف دیکھو!" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

سب نے دیکھا۔

مشرقی مینار کی بنیاد کے پاس ایک لالٹین ہل رہی تھی۔ اور اس کے گردیلچے اٹھائے سائے۔ کھدائی شروع ہو چکی تھی۔ آج رات۔ ابھی۔

اور ان کے بیچ ایک بھاری بھر کم شخصیت۔ جس کی انگلی میں لالٹین کی روشنی میں کچھ چمک رہا تھا۔

عربیہ نے حمزہ کا ہاتھ دبایا اور سرگوشی کی:

"ہمیں جو تھی مہر چاہیے... اور وہ اس کی انگلی میں ہے۔"

فجر کی اذان میں ابھی کچھ دیر تھی جب وہ مشرقی مینار کی بنیاد پر پہنچے۔

حمزہ، عربیہ، فرحان، عثمان — اور ان کے ساتھ نذیر چاچا، جن کی آنکھوں میں ساٹھ سال پرانی نیند اب بھی تھی، اور رضیہ بی بی، جن کے ہاتھ میں تہہ کیا ہوا وہ صفحہ تھا جو اب وقف نامے کا حصہ بن چکا تھا۔

مینار کی بنیاد میں ایک چوڑا پتھر تھا — بالکل ویسا جیسا رضیہ نے بتایا تھا: وہیں جہاں وقف کی پہلی اینٹ رکھی گئی تھی۔ پتھر پر چار گول دائرے بنے تھے، ہر دائرے کے بیچ ایک چھوٹا سا خانہ۔

"تین مہریں ہمارے پاس ہیں،" عربیہ نے کہا۔ اس نے ایک ایک کر کے مہریں نکالیں — دادا ابو والی، نذیر چاچا کی انگوٹھی والی، اور رضیہ بی بی کے خاندان والی۔ تینوں مہریں تین دائروں میں بالکل فٹ بیٹھیں۔

چوتھا دائرہ خالی تھا۔

"چوتھی مہر اس کے پاس ہے جو دروازے بند کرے اور کھولے،" حمزہ نے دہرایا۔ "مگر یہ ہے کون؟"

عربا کی آنکھیں چمکیں۔ "نذیر چاچا - حویلی کے دروازے کس نے بنائے تھے؟
ساٹھ سال پہلے؟"

نذیر نے مینار کو دیکھا۔ "مستری رحیم الدین۔ اس کے ہاتھ کے بنے دروازے
آج بھی نہیں ٹوٹے۔"

"اور مستری رحیم الدین کا پوتا کون ہے؟" عربا نے آہستہ کہا۔

اسی لمحے چچھ سے انجنوں کی آواز آئی۔ دو ٹرالیاں، ایک جے سی بی - اور ان
کے آگے بلڈر ملک، ہاتھ میں کاغذات لہراتا ہوا۔

"یہ زمین میری ہے!" وہ چلایا۔ "ڈیمو لیشن کے کاغذات میرے پاس ہیں -
سورج نکلتے ہی یہ مینار گرے گا!"

"یہ زمین وقف ہے!" حمزہ آگے بڑھا۔ اس نے وقف نامہ بلند کیا۔ "نہ آپ کی، نہ
ہماری۔ یہ اللہ کی ہے۔ اسکول اور اسپتال کے لیے وقف!"

ملک ہنسا۔ وہ ہنسی جس میں خوف چھپا تھا۔ "وقف کے کاغذ؟ وہ تو میں نے دس
سال پہلے جلا دیے تھے!"

"آپ نے نقل جلائی تھی،" رضیہ آگے آئیں۔ ان کی آواز پتھر کی طرح ٹھہری
ہوئی تھی۔ "اصل میرے پاس تھی۔ میرے ابا نے آپ کے ابا کے ساتھ مل
کر سچ دیا تھا۔ مگر میں دبانے نہیں آتی۔ میں حساب چکانے آتی ہوں۔"

ملک کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ "رضیہ... تم..."

"میں نے آپ کو اس صفحے کی تصویر بھیجی تھی،" رضیہ نے کہا۔ "مگر میں آپ کی ملازم نہیں تھی۔ میں آپ کا اگلا شکار تھی۔ اور اب شکار بولے گا۔"

اسی لمحے فرحان دوڑتا آیا۔ اس کے ساتھ پولیس کی جیب تھی۔ اور جیب سے اترا ایک نوجوان۔ فہد۔

"ملک صاحب،" فہد نے کہا، اور اپنا فون بلند کیا۔ "آپ کی اپنی آواز۔ جس میں آپ نے بتایا تھا کہ نذیر چاچا کو باؤلی میں کیسے دفن کیا، وقف کے کاغذ کیسے جلائے، اور اس حویلی کو گرانے کا اصل منصوبہ کیا ہے۔ ریکارڈنگ پولیس کے پاس جا چکی ہے۔"

ملک کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک پرانی پیتل کی مہر نکالی، جو چابی کے حلقے میں پروئی ہوئی تھی۔ اس کے دادا کی نشانی۔ اس کی "لکی" مہر۔

"یہ... یہ تو بس پرانی چیز ہے،" وہ بڑبڑایا۔

"نہیں،" عربیانے کہا۔ "یہ چوتھی مہر ہے۔ مستری کی مہر۔ اس کے پاس جو دروازے بند کرے اور کھولے۔ آپ کے دادا نے اس حویلی کے دروازے بنائے تھے۔ یہ مہر آپ کے خون کی امانت ہے۔"

ملک کی آنکھوں میں پاگل پن اتر آیا۔ "کوئی چوتھا دروازہ نہیں کھلے گا!" وہ چلایا، اور مہر کو باؤلی کی طرف پھینکنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

مگر نذیر چاچا بجلی کی طرح بڑھے۔ انہوں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ کشمکش میں مہر چھوٹی۔ اور چوتھے دائرے پر جا گری۔

ایک لمحے کے لیے سب ساکت ہو گیا۔

پھر پتھر گر جا۔ چاروں دائرے ایک ساتھ چمکے۔ اور مینار کی بنیاد کا وہ چوڑا پتھر آہستہ آہستہ دھسنے لگا۔

"میں نے تو اسے کھولنے کی کوشش بھی نہیں کی!" ملک چلایا۔

"وقف کا دروازہ کوشش نہیں دیکھتا،" نذیر چاچا نے کہا، ان کی آواز میں ساٹھ سال کا بوجھ تھا۔ "وہ خون دیکھتا ہے۔ امانت خون میں ہوتی ہے۔ نیت میں نہیں۔"

سیرھیاں نیچے اترتی تھیں۔ چاروں بچے، نذیر، رضیہ۔ سب نیچے اترے۔ ملک کو پولیس نے اوپر ہی روک لیا تھا۔

نیچے ایک کوٹھری تھی۔ اور کوٹھری میں۔ مٹی کے گھڑوں میں سونے کی مہریں، چمکتی ہوئی۔ اور سب سے اوپر، شیشے کے ڈبے میں۔ مکمل وقف نامہ، جس پر اب چاروں مہریں لگ چکی تھیں۔

اور وقف نامے کے ساتھ ایک خط - نواب ذوالفقار علی خان کے ہاتھ کا:

"یہ خزانہ میرا نہیں۔ یہ ان بچوں کا ہے جو یہاں پڑھیں گے، اور ان مریضوں کا ہے جو یہاں شفا پائیں گے۔ جو اسے اپنا سمجھے، وہ امانت میں خیانت کرے گا۔" حمزہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "دادا ابو کا خواب... پورا ہو گیا۔"

اگلے مفتے عدالت نے فیصلہ سنا دیا - وقف نامہ اصلی، زمین وقف، حویلی محفوظ۔ ملک گرفتار۔ رضیہ اور دادا ابو نے مل کر وقف رجسٹر کرایا - نواب صاحب کے خاندان اور میاں فضل الدین کے خاندان کی مشترکہ امانت، ساٹھ سال بعد پوری ہوئی۔

حویلی کے صحن میں اعلان ہوا: یہاں "وقف اسکول" بنے گا - اور ایک طرف چھوٹا سا شفا خانہ۔

اور نذیر چاچا؟ انہیں اسکول کا پہلا دربان بنایا گیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ یہ ذمہ داری کیوں لے رہے ہیں، تو انہوں نے مسکرا کر کہا:

"ساٹھ سال میں نے دروازے بند کیے۔ اب کھولوں گا بھی۔ چوتھی مہراب میرے پاس امانت ہے۔"

مگر کہانی یہیں ختم نہیں ہوئی۔

خزانے والی کو ٹھہری کی صفائی کے دوران عریبانے مہروں کے گھڑوں کے چھچھے
ایک چھوٹا سا طاق دیکھا — اتنا چھوٹا کہ پہلے کسی کی نظر نہ پڑی۔ طاق خالی تھا۔
مگر طاق کے فرش پر تازہ قدموں کے نشان تھے۔
اور دیوار پر، تازہ روشنائی میں، ایک سطر لکھی تھی:
"امانت ابھی پوری نہیں ہوئی — پانچواں دروازہ کہیں اور ہے۔"
چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حمزہ نے مسکرا کر کہا:
"لگتا ہے... کہانی ابھی باقی ہے۔"

--- ختم شد ---

یہ کتاب NazmHub پر مفت پڑھنے کے لیے شائع ہوئی — nazmhub.pages.dev